ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۴ نومبر ۱۹۹۰ء — ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ عدد ۳

فہرست مضامین

رابطہ وترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۶۸۶۳۶ - ۳۲۴۴۶۸ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زرسالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خلیجی حالات کے متعلق ایک بے تکلف دوست کا خط ملا۔ اسی کے جواب میں یہ اشارات لکھے گئے، کیونکہ مسئلۂ خلیج آجکل ہر محفل میں زیر بحث اور ہر مسلمان کے لیے وجۂ اضطراب ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ قومی و دینی و عالمی مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں اور کبھی کبھار اظہارِ خیال بھی کرتے ہیں۔ پھر اچھی بات یہ کہ آپ کا دامنِ فکر قرآن وسنت سے بندھا رہتا ہے۔ یوں ہم بنیادی طور پر متحد ہوتے ہوئے دوستانہ اختلاف کر سکتے ہیں۔ چند ابتدائی باتیں ـــــ

پہلی بات یہ کہ تاریخ جب زیرِ تشکیل ہوتی ہے تو آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہونے کے باوجود حالات کی اگلی کروٹوں کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔

دوسری یہ کہ قرآنی آیات و احادیث کے متعلق (مثلاً سورۂ مائدہ آیت ۴۶ یا سورۂ مائدہ آیت ۵۱ کے بارے میں ہی نہیں)، عمومی طور پر یہ پیشِ نظر رکھیے کہ ان کے صحیح منطوق کو متعین کرنے کے لیے مسائل کے سارے اینچ پینچ دیکھنے پڑتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کون سی آیت فوری نتیجہ دیتی ہے، کون سی ایسی ہے کہ پچاسوں سال یا صدیاں گزرنے کے بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں، نیز کس بنا پر کسی خاص واقعہ پر اسے چسپاں کرنا لازم ہے۔

تیسری یہ کہ جب معاملہ کسی فردِ واحد یا قومِ واحدہ کے کسی متعین عمل کا ہو تو اس

پر غور و فکر کر کے نتائج نکالنا آسان ہے۔ مگر جب چار پانچ قوموں کا عمل در عمل کام کر رہا ہو تو پھر ہم جیسے عامیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کے عمل کو الگ الگ لیں اور اس کے متعلق رائے قائم کریں۔ بعدۂ مشیت کے مخفی پروگراموں کے متعلق قیاس آرائیاں کریں جو پردۂ غیب میں ہوں۔ ایسی کوشش کو قرآن نے رجماً بالغیب کہا ہے۔

یعنی مشکل یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف آپ "تاریخی حرکت و عمل کے ظاہری دلائل و وجوہ کو دیکھتے ہیں، دوسری طرف آپ کی نظر الہامی آیات و اشارات پر ہوتی ہے، پھر ان کو حسب منشا (یعنی جیسے آپ کا مطالعہ و تفکر رہنمائی کرے) باہم دگر چسپاں کرتے ہیں۔ اس طرح تو بیان میں رنگ تضاد آجاتا ہے جو قرآن اور حدیث کی پیشینگوئیوں کو درمیان میں لانے کے بعد اچھا نہیں لگتا۔ یہ تو عجیب ہے کہ الہامی حتمیت بھی اور قیاس آرائیاں بھی۔

چوتھی بات یہ کہ ایسی پُرپیچ بحثوں میں آدمی بسا اوقات کسی بڑے مجرم کو درکنار رکھ دیتا ہے، اور کسی اور مضطر و مجبور کو تاہ کار کو پکڑ کر اپنی عدالت میں کھڑا کر لیتا ہے۔ یہی آپ نے سعودی عرب کے ساتھ کیا۔

اب میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے حالات کی وہ ترتیب رکھوں، جس کے مطابق مختلف کردار رونما ہوتے اور انھوں نے تاریخ کے اسٹیج پر اپنا کمال پیش کیا۔

ا۔ صدام حسین اور اس کے ساتھ عراق اس ڈرامے کا اصل ہیرو ہے۔ ذرا قرآن سامنے رکھ کر عراق کی دورِ بعثی کی تاریخ دیکھیے، پھر اس کے ایران پر حملے کو لیجیے، پھر کردوں پر کیمیکل بم برسا کر دو منٹ میں بستیوں کی بستیوں کو موت کی نیند سُلا دینے کے واقعات پر نظر ڈالیے، پھر کویت پر اس کی چڑھائی کو لیجیے۔ پھر سعودی عرب کو اس کی طرف سے دیے جانے والے چیلنج کو دیکھیے۔

ہر جارحانہ ظلم ہے، جنگ مسلم قوم بخلاف مسلم قوم اشد ظلم ہے اور دنیا بھر میں

مسلمانوں کے لیے رسواکن بھی، اور باہمی پیچیدگیاں پیدا کرنے کا سبب بھی۔ عراق نے کویت کو جس طرح تہس نہس کیا ہے، جس طرح وہاں سے دولتِ سرکار ہی نہیں، گھروں کے سامان لوٹے ہیں۔ اعلیٰ خاندانوں کی عورتوں کو سڑکوں پر لا کر جس طرح ان کو نشانۂ ہوس بنایا ہے، جس طرح غیر ملکیوں کو بلا جوازِ شرعی پابند کیا ہے اور ستایا ہے، اور جس طرح پاکستان کے ہزاروں قابل افراد اور مزدور افراد کو طرح طرح سے دِق کیا ہے، اذیتیں دی ہیں۔ ان کے سامان اور ان کی جمع پونجی تو رہی ایک طرف، جو سامان یا گاڑیاں وہ لے کے کسی طرف بھاگے ہیں، ان کو راستے میں جگہ جگہ عراقی پوسٹوں پر روک کر ان سے سامان چھینے گئے، گھڑیاں اور زیورات لوٹے گئے۔ حتیٰ کہ اکثر لوگوں کی تو گاڑیاں بھی گئیں۔ بے شمار بھائی ریگستان میں لُو کے تھپیڑے کھاتے اور سائے اور روٹی پانی کو ترستے بچوں کو بچانے کی کوششیں کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں کو گولی مار دی گئی، کئی بچے اور بڑے صحرا کی بھٹی میں بھسم ہو گئے۔ ایک آزاد اور بین الاقوامی طور پر مسلّمہ ریاست کا وجود ختم کر دیا گیا۔ اس کے محلات اور عمارتوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا، اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا گیا۔ مقامی آبادی کو نہ صرف لوٹ لیا گیا، بلکہ وہ بدترین غلامی میں مبتلا کر دی گئیں، چنانچہ نوجوانوں کو عراق لے جا کر غلاموں کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ زچگی کے ہسپتالوں کے انکیوبیٹرز سے نومولود بچوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا اور وہ دنیا میں پوری طرح آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی عدم آباد کو سدھارے۔ زچگان کو نہایت بُری حالت میں کھدیڑ دیا گیا۔ اور کچھ کی موتیں واقع ہوئیں۔

میرا خیال ہے کہ تاتاریوں کے بعد ایسی درندگی اور کسی نے نہ کی ہوگی۔

ع یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یہود تو خوب بغلیں بجا رہے ہیں کہ ہمارا کام کرنے کے لیے خود مسلمان زیادہ چیرہ دست اور بے رحم ہیں۔

اتنے بڑے حادثۂ ظلم پر آپ کے اعصاب میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی اور نہ آپ کو کوئی آیت اس کردار اور اس رویّے کے متعلق یاد آئی۔

یہ بھی آپ کو شاید زیادہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ جزیرہ کے سرے پہ واحد یہ ایسی ریاست تھی جس نے اسلامی جمہوریت کی راہ پر خاصی پیش قدمی کر لی تھی۔ جس کے بعض لوگ عیاشیاں بھی کرتے ہوں گے، مگر جتنی بڑی مقدار دولت عوام کی ضروریات اور صحت و تعلیم پر خرچ ہوتی تھی ایسا معیار اور کہیں بھی نہ تھا۔ پھر یہاں وہ سرچشمہ ہائے فیض جاری تھے، جن کے ذریعے دُنیا میں اسلامی جہاد اور اسلامی تعلیم اور اسلامی دعوت اور یتیم بچوں اور بیواؤں کی وسیع پیمانے پر خدمت ہو رہی تھی۔ یہی خدمت اصل میں مغرب کو کھٹکتی تھی کہ اس سرچشمہ کو پاٹے بغیر فنڈامنٹلزم کی نشوونما کا سدِباب نہیں ہو سکتا۔

ہماری اُمت کے ایک "جنگی مجذوب" قسم کے قائد نے دشمن کا یہ کام کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے پاس ناصر اور صدام جیسے "جنگی مجذوب" ہی رہ گئے ہیں۔ کوئی مدبر لیڈر، جو آپ کی طرح قرآن کی آیات اور رسولؐ کی احادیث پر غور کرے اور سوچ سمجھ کر تاریخ میں اپنا مقام متعین کرے اور سب سے پہلے خود عالمِ اسلام کے بارے میں طے کرے کہ متحد مغرب کا فکری، تہذیبی، معاشی اور عسکری مقابلہ کرنے کے لیے کیا طریقِ کار یہی رہ گیا ہے کہ پہلے مسلمان آپس میں گھتم گتھا ہوں۔ الف، ب کے خلاف، اور ب، ج کے خلاف۔

جب تک اِس قسم کے جنگی مجذوب قائد ہمارے ہاں پیدا ہوتے رہیں گے اور جب تک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ان کو صلاح الدین ایوبی بلکہ (نعوذ باللہ) مہدی تک سمجھتی رہے گی، اُس وقت تک مسلمانوں کے لیے تباہی کے سوا تقدیر کے پاس کچھ نہیں ہے۔ دُنیائے عرب میں یہ نعرہ بھی گونجا کہ چاہے کوئی چور ڈاکو بھی اُٹھے، لیکن لڑ بھڑ کر اپنا مقام بنالے اور اُس کی ترکتازیوں کی وجہ سے تمام مسلمان اس کے گرد جمع ہو جائیں تو ہمیں ہزار بار یہ منظور ہے۔ (الفاظ میرے ہیں)، یعنی چوروں اور ڈاکوؤں کے ذریعے تو اتحاد ہو سکتا ہے، مگر خدا اور رسولؐ اور قرآن و حرم کے ذریعے نہیں۔ ؏ یہ اُمت کتنی احمق ہو چکی ہے

آج صدام عربوں کی ایک بڑی تعداد کی نگاہ میں "ہیرو" ہے۔ آپ فلم میں دیکھتے ہیں ناں کہ ممکن نہیں ہوتا کہ کوئی شریف اور نیک دل اور بااُصول آدمی "ہیرو" ہو، بخلاف اس کے شورش انگیز، ہنگامہ خیز اور مار دھاڑ کرنے والا کوئی آدمی ہیرو ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہماری ملی تاریخ کے سینما گھر میں بھی اسی قسم کے ہیرو اور لیڈر آئیں گے اور لوگ انہیں کی جوتیاں چومیں گے۔

۲ — دوسرے نمبر پر کویت کا مسئلہ تھا۔ لیکن اس کے متعلق بات پہلے کافی حد تک ہو چکی۔ مزید صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے حکمران اور شہری زیادہ تر شریف قسم کے پابندِ صوم و صلوٰۃ لوگ تھے۔ ان کی طرف سے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ تھی۔ کبھی کسی پر حملہ نہیں کیا، کسی کو دھمکی نہیں دی، کسی سے کچھ چھینا نہیں۔ کوتاہی صرف یہ رہی کہ انہوں نے اپنی مضبوط فوج (چاہے وہ مختصر ہی ہو) جدید وافر اسلحہ کے ساتھ تیار نہیں کی۔ اور نہ آس پاس کی ریاستوں اور سعودی عرب سے مل کر کوئی مشترکہ نظامِ دفاع تیار کیا۔

اِس کوتاہی کی سزا میں کیسے کیسے لوگ کِن کِن حالات سے دوچار ہوئے، بڑا سامانِ عبرت ہے[1]

کویت کو جس جرم کی سزا مغرب والوں نے بڑے ہیر پھیر سے دلوائی ہے وہ یہ ہے

[1] کچھ لوگ یہاں بھی فوج کے وقار کو مجروح کرتے رہتے ہیں، دوسری طرف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ دفاع پر اتنا زیادہ خرچ کرنے کے بجائے زرعی و صنعتی اور تعلیمی و معالجاتی ترقی کو اصل میدانِ توجہ بنانا چاہیے۔ ایسے بزرجمہر کویت اور سعودی عرب وغیرہ کے حالات سے سبق لیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک وقت کی روٹی پہ اکتفا کر کے اپنی فوج کو موجودہ حالت سے دوگنی طاقت تک پہنچانا چاہیے۔ اِس غرض کے لیے ایک دس سالہ منصوبہ بنا لیا جائے۔ ہم خدا اور رسول ﷺ کی محبت کے سائے میں عزت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

کہ جیسے آپ نے بیان کیا، امریکہ وغیرہ کو یہ رپورٹیں جگہ جگہ سے مل رہی تھیں کہ افغانستان میں، بنگلہ دیش میں، سری لنکا میں، پاکستان میں، سوڈان، الجزائر، الجیریا اور مصر میں ہر جگہ کوئی قوت مغربی تاخت و تاریخ کی مزاحمت کر رہی ہے۔ خصوصاً صلیبیوں کا مشنری کام بے حد خراب ہو رہا ہے۔ جوابی مسلم طاقت زور پکڑ رہی ہے۔ اور ادارے بنا کر تیزی سے کام کر رہی ہے۔ اس پر امریکہ اور مغربی طاقتوں نے تحقیقات کی اور یہ راز پکڑ لیا کہ یہ ساری "شرارت" کویت کی ہے۔ پس کویت کو سزا دینے اور اس "اڈے" کو اڑا دینے کا فیصلہ ہو گیا۔

اس کی تفصیل کہ کویت کے خزانے کی گرانٹس اور تاجروں اور مالداروں کی طرف سے جو فنڈ مختلف دائروں میں کام کر رہے تھے مولینا خلیل حامدی کی قلم سے متعدد اخباروں میں چھپی ہے، اسے ضرور پڑھ لیں۔ ایک گنجلک قضیے کو سامنے رکھا ہے تو پہلے اس کی ساری معلومات تو جمع کر یں۔

یہ بات آگے بیان ہو گی کہ کویت کا خاتمہ کرانے کے لیے صدام حسین کو کس طرح آلۂ کار بنایا گیا۔

۳۔ اب ہم تیسری طاقت کو لیتے ہیں جو بظاہر الگ تھلگ دکھائی دیتی ہے، مگر اس کھیل کا ایک اہم مگر پس پردہ کردار ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ صدام حسین نے کچھ ہی عرصہ قبل اسرائیل کو دھمکی دی تھی کہ وہ اس پر حملہ کرے گا۔ میرے خیال میں ابھی وہ اس قابل نہیں تھا اور اسے یہ بات چند سال اور سینے میں دبا کر رکھنی چاہیے تھی، بشرطیکہ وہ مدبر ہوتا۔ بدقسمتی سے وہ مجذوب نکلا اور مجذوب کی بڑ تو مشہور ہے ہی، اس نے قبل از وقت اسرائیل کو چوکنا کر دیا۔ آپ کا مطالعہ اتنا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ غارت گرانِ مغرب جب کسی طرف سے جنگ کا خطرہ نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں تو یا تو وہ غیر جنگی چالوں سے اس کا انسداد کرتے ہیں یا التوا کراتے ہیں، یا پھر اس کا رخ اپنے کسی حلیف سے ہٹا کر دشمن طاقت (سب سے بڑے دشمن مسلمان

ہیں ــــ خصوصاً فنڈا منٹلسٹ) کی طرف موڑ دیتے ہیں ۔

سفارت خانہ اور را کے مردانِ خاص (و زنانِ خاص) اور تمام ٹھیکہ دار اور انجینئر اور بڑے درجے کے دفتری اور کارخانہ داری نظام میں کام کرنے والے سب تازہ بہ تازہ رپورٹیں ہمیشہ اپنے ملک کو بھیجتے رہتے ہیں ۔ اور تمام عرب ممالک کو آگاہ ہونا چاہئے کہ بھارت جہاں ان کو اقتصادی طور پر نچوڑ رہا ہے اور ثقافتی طور پر خلل اندازی کر رہا ہے، وہاں وہ پورے زور سے جاسوسی کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لیڈروں نے اسلامی ممالک کو رام راجیہ کے زیر اثر لانے کے لیے ایسے صریح اعلان کر رکھے ہیں جو تاریخ کے ریکارڈ پر محفوظ ہیں ۔

ہاں تو بڑی اسکیموں کے علاوہ بھارت کی تجارتی اور ثقافتی اسکیمیں بھی کام کرتی ہیں ۔ خاص بات یہ کہ عراق کو کیمیکل وارفیئر کے لیے بھارت نے بھی مدد دی ہے۔ بذریعہ سامان بھی اور بذریعہ ماہرین بھی ۔ کیمیاوی سامان بھجوانے کی خبر تو ابھی دس پندرہ روز پہلے اخبارات میں آچکی ہے ۔

تو بھارت کے ڈپلومیٹ اور ماہرین صدام حسین اور اس کے معتمد علیہ حلقہ خاص (جو بہت مختصر ہوگا) کام کرتے رہے ہیں ۔ کچھ چالیں انھوں نے ایران کی جنگ کے زمانے میں چلی ہوں گی اور کچھ اب بڑی لجاجت سے (ہاتھ جوڑ کر) کام لیتے ہوئے سرگوشیاں کی ہوں گی کہ آپ کو خدا نے ایک ایسی قوت بنا کے اٹھایا ہے کہ سارا عرب آپ کے زیر نگیں ہوگا، جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کا تیل آپ کے پائپوں سے دنیا کو ملے گا ۔ تو سرکار آپ اسرائیل کی جنگ کو مؤخر کر کے پہلے ایک ہاتھ کویت پر مار لیں (آخر بھارت کو بھی کویت کی خدمتِ اسلام کی سرگرمیاں گراں گزرتی ہوں گی) اور پھر طاقت بڑھ جائے گی ۔ بیچ میں ہو سکے تو سعودی عرب کو بھی سبق سکھا دیجیے۔ بعد ازاں اسرائیل کا معاملہ سہل تر ہوگا ۔ آپ کی اتنی بڑی سلطنت ہوگی اور دنیا بھر کے مسلمان آپ کے ساتھ ہوں گے ، ہر طرف واہ واہ ہوگی ۔ یہ پھونک دی گئی تو "مجذوب مردِ جنگی" نشے میں آگیا ۔ اور آناً فاناً کویت کا صفایا ہوگیا ۔ نہ اسلام کی

طرف سے کوئی اذن (SANCTION) نہ عقلی انصاف اس کارروائی کے حق میں اور نہ بین الاقوامی سمجھوتے اور ضابطے اور حقوقِ انسانی کے چارٹر ذریعۂ جواز۔
یہ بھارت جو اشد درجے کی بہیمیت سے کشمیری نوجوانوں کو قتل اور خواتین کے نوامیس کو تباہ کر رہا ہے، جس نے اپنی کثیر التعداد مسلم اقلیت کو متعصب غیر عقلی منافرت کی چکی میں بار بار پیسا ہے، وہ اب کویت میں جھاڑو پھروا چکا ہے اور سعودی عرب کو صدام کے نشانے پر لے آیا ہے۔ محض اس لیے کہ اسرائیل بچ نکلے۔ اور اسرائیلی سپاہی اور جاسوس امریکی فوج کے اندر شامل ہیں اور اب وہ مشرقِ وسطیٰ، خصوصاً سعودی عرب کا جنگی اور نفسیاتی جائزہ ضرور لے رہے ہوں گے۔
افسوس کہ یہ دشمنِ دین و ملت آپ کو نظر آیا ہی نہیں، اور کیسے آئے جب کہ وہ پسِ پردہ رہ کر سلسلہ جنبانیاں کر رہا ہے۔
یہاں آخر میں میں یہ امر بھی واضح کر دوں کہ انڈیا کی تفصیلی کارگزاری کے باوجود امریکہ کا براہِ راست دخل بھی ہے۔
امریکہ عراق پر بڑے اثرات رکھتا تھا۔ ایران سے عراق کی جنگ کے دوران میں امریکہ نے عراق کو بہت مدد دی، کیونکہ وہ جذبۂ انتقام کے زیر اثر تھا۔ بڑی طاقتوں سے بسا اوقات کسی چکر میں آ کر ایسی بیوقوفیاں ہو جاتی ہیں کہ بعد میں اُن کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ پہلے بعض دور میں رُوس نے عراق کو مضبوط کیا، اب جب رُوسی سلسلہ ختم ہوا تو امریکہ نے نوازشات فرمانا شروع کیں۔ بلکہ ساتھ ہی کویت اور سعودی عرب نے بھی عراق کو مالی مدد دی، کیونکہ اُس نے جنگ کو ایرانیوں اور عربوں کی جنگ قرار دیا۔ اب عراق اتنی قوت رکھتا ہے جتنی کسی عرب ملک کے پاس نہیں ہے۔ اب امریکہ کی شرارت دیکھیے کہ صدر بُش نے تقریروں اور بیانوں میں صاف اشارہ دیا کہ عراق کویت پر حملہ کرے تو امریکہ دخل نہیں دے گا۔ اس بیان پر امریکی کانگریس کی تعلقاتِ خارجہ کی سب کمیٹی میں حکومت اور اپوزیشن کی دونوں پارٹیوں نے سخت گرفت کی ہے کہ اس واقعہ کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے۔ اب دیکھیے کہ اسی کویت (اور ساتھ ہی سعودی عرب)

پہ کرم کرنے کے امریکہ کی بحریہ اور مغرب کی افواج خلیج میں موجود ہیں۔

لیکن یہ کام تنہا امریکہ ہی کا نہیں، اس میں بھارت کا بھی دخل ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ عراق (صدام) سے بھارت کی دوستی ہے۔ برسوں سے بھارت وہاں کی تعمیرات و تنصیبات کے ٹھیکے لے کر اپنے ماہرین اور "را" کے کارندوں ـــ مردوں اور عورتوں ـــ کے ساتھ عراق کی جڑوں تک اترا ہوا ہے۔ تجارت، ثقافت، عسکری ضروریات وغیرہ میں بھارت کے عراق پر بڑے احسان ہیں۔ حال ہی میں بھارت نے کیمیکل بموں وغیرہ کے لیے سامان عراق کو بھجوایا ہے، جس کی خبر اخباروں میں آچکی ہے۔ ممکن ہے پہلے سے یہ سلسلہ چل رہا ہو اور اس ٹیکنالوجی کے ماہرین بھارت سے بھی لائے گئے ہوں۔ پھر بھارت جس کے سامنے مسلمان ملکوں کو زیرِ تسلط لینے کا منصوبہ قیامِ پاکستان سے پہلے اس کے اکابر نے برسرِ عام فاش کر دیا تھا ـــ فی الحال اس کا پہلا پروگرام یہ ہے کہ مسلم ممالک میں (خصوصاً مشرقِ وسطیٰ) نفوذ کرے، تعمیراتی اور تنصیباتی کاموں کے ٹھیکے لے، ہسپتالوں میں دخل حاصل کرے، تجارتی منڈیاں حاصل کرے، پوری پوری جاسوسی کرے، انگلش پریس میں اپنے انگریزی صحافیوں کو گھسا کر پروپیگنڈا مشینری پر قابض ہو ـــ اور جب جہاں موقع ملے، مسلم ممالک میں منافرت پیدا کرے، ان کو لڑائے اور تباہی پھیلائے۔

اسی جذبہ سے امریکی اور اسرائیلی (دونوں قومیں بھارت کی دوست ہیں) اشارے سے اس نے صدام حسین کو عالمِ عرب کی سرداری کا تصور دلاتے ہوئے کویت پر حملہ کرنے کی تفصیلی ترغیب دلائی ہو گی۔ قریب ترین چھوٹا سا ملک، دولت بہت، تیل بہت[لے]، فوج کم، پلک جھپکنے میں قبضہ ہو جائے گا۔ بعد میں یو این او چیخے گی اور امریکہ

لے مجموعی ملکی پیداوار تیرہ کروڑ تینتس لاکھ ڈالر۔ کویت کے تیل کی برآمد ۱۹ لاکھ ۵ ہزار بیرل روزانہ۔ اس کے مقابلے میں عراق: ۳۱ لاکھ بیرل روزانہ، سعودی عرب: ۵۴ لاکھ، ۵۰ ہزار بیرل روزانہ۔

اور مغربی طاقتیں دوڑی بھی تو مگر وقت گزر چکا ہو گا۔

یوں کویت کا جھٹکا کیا گیا۔

اس "بی جماعت" نے ریگ زارِ عرب میں کویت کے آشیلنے کو جلوا کر چند نمایاں مفاد حاصل کیے ہیں:

ا۔ پاکستان کی سرحدوں پر جمع کردہ فوج کے پُرخطر اور عالمی حیثیت سے پُرضرر مسئلے سے دُنیا بھر کی توجہ ہٹوا دی ہے، بلکہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ خود مسلم ممالک کو ہماری اس مصیبت سے بے تعلق کر دیا ہے۔ اسی تبدیلی کی وجہ سے کیل سیکٹر کی طرف بھارتی حملے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

ب ۔ اس سے بھی زیادہ بڑی کامیابی اس کی یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر جسے حریت پسندوں کی سرگرمیوں نے بھڑکتا ہوا آلاؤ بنا دیا تھا، اب مسلم ممالک اور عالمی نظروں کی توجہ اس سے ہٹ گئی ہے۔

ج ۔ بھارت کے تعلقات ایک طرف عراق سے اور دوسری طرف اسرائیل سے بہت بڑھ گئے ہیں۔

د ۔ افغانستان، بنگلہ دیش، مقبوضہ کشمیر اور خود پاکستان میں جو خاموش قسم کی امدادی سرگرمیاں دینی اداروں کے لیے جاری تھیں وہ یک لخت ختم ہو گئی ہیں۔ یہی اثر افریقی ممالک پر پڑا ہے۔

نوٹ:۔

صرف ایک پہلو سے بھارت فی الحال خسارے میں ہے۔ خلیجی قضیئے کی جو ڈرامائی تصویر لیکایک بن گئی ہے اس میں بھارت کو کوئی مقام نہیں مل سکا۔ اس کے لیے اُس کی مساعی جاری ہوں گی اور ہمارا چالاک ہمسایہ کوئی نہ کوئی راستہ بنا لے گا مثلاً مغربی افواج کی افواج اور بحریہ کے جہازوں کے لیے کسی طرح کی سپلائی اپنے ذمے لے لینا، یا خلیجی حالات سے منڈیوں کی ترتیب میں جو تبدیلی آنے والی ہے، اس سے فائدہ اُٹھانا۔

۴ ۔ اب ذرا ایک منظر امریکہ (+ اسرائیل) اور اس کے مغربی حواریوں پہ! یہ تو واضح ہے کہ (یہود و مشرکین، بلکہ ہنود و نصاریٰ بھی) سب کے سب کی پالیسیوں کی ظاہری مسکراہٹ کے پیچھے اسلام اور مسلمانوں کے لیے خوفناک ڈنک چھپا ہوتا ہے ۔ اس بارے میں آیت قرآنی (لا تتخذوا الیہود ولا النصاریٰ اولیاء) کے حرف حرف کی تصدیق ۱۴ صدیوں کی تاریخ بار بار کرتی چلی آرہی ہے ۔ اب جو مغرب کے مادہ پرستوں نے دیکھا کہ میدان سے وہ حریف (روس) ہٹ گیا ہے جس کی سرد جنگ انہیں ایک لمحے کا وقفہ نہیں دیتی تھی، بہترین موقع ہے کہ جہاں سے جو مفاد حاصل کرنا ہو اور جسے جو نقصان پہنچانا ہو، وہ پہنچا لیں ۔

چنانچہ بش گورنمنٹ نے مشرق وسطیٰ میں ریموٹ کنٹرول سے ایک دھماکہ کر دیا، جس کا ذریعہ صدر صدام بنا ۔ ایک طرف ایک مسلم قوت کو جو ابھر کر خطرناک بن سکتی تھی (اسرائیل کے لیے) اسے اتحاد اسلامی کے امکانات کا راستہ روکنے کا ذریعہ بنا دیا ۔

صدام نے کویت کا صفایا کر کے اور سعودی عرب کو جنگ کی دھمکی دے کر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بظاہر عرب کے تحفظ کے لیے سارا مغرب امڈ پڑا ہے، اور تحفظ کی اس خدمت فی سبیل اللہ میں اسرائیل اور اس کے سپاہی بھی شریک ہیں ۔

اب خلیج میں دنیا کی واحد سپر پاور اور اس کے حواریوں کا سمندر پہ تخت بچھا کر بیٹھے رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ تقریباً پورے اسلامی ممالک پر اپنی نظریں اور پنجے گاڑ سکتا ہے ۔ وہ اب براہ راست ہر جگہ مداخلت کر کے فنڈا منٹل ازم کی رَو کو روک سکتا ہے، وہ قرضوں، ایڈ اور سفارتی ذرائع نیز پروپیگنڈے کے وسائل سے داخلی سیاست اور خارجہ تعلقات میں اپنا اثر استعمال کر سکتا ہے ۔ خلیج میں صلیبیوں کا مرکز ہونے کا ایک اثر یہ ہو گا کہ ان کی مشنری سرگرمیاں پہلے سے زیادہ زور شور سے چلیں گی اور ان کے تعلیم وصحت کے ادارے لوگوں پر جسمانی اور

دماغی اثرات کے ساتھ ساتھ روحانی اثر بھی ڈالیں گے۔

اب سعودی عرب کے لیے بھی ممکن نہ ہو گا کہ وہ اپنے ریالوں سے عالمِ اسلام میں کوئی خدمات سرانجام دے سکے۔

سب سے بڑا مقصد اس فوجی و عسکری ہجوم سے یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے ساتھی جنگِ عظیم اوّل کے بعد جس طرح مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے علاقے بانٹ کر بیٹھ گئے تھے اور استعمار کے لمبے دور سے مسلمانوں کو گزرنا پڑا۔ اب پھر یہ ہونے والا ہے کہ تیل کے چشمے جہاں جہاں ہیں وہاں مناسب تعداد میں فوج بٹھا دی جائے گی اور دلیل یہ ہو گی کہ چونکہ عرب حکومتیں تیل کے چشموں کی حفاظت اور تیل کی سپلائی بحال رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ فرض ہمیں انجام دینا ہو گا اس طرح نئے سرے سے ایک دورِ استعمار شروع ہو گا۔

۵۔ اب آئیے سعودی عرب کی طرف۔ ایک ایسا ملک جس نے کبھی کسی پر زیادتی نہیں کی، ایک ایسا ملک جس کے حکمران اگر کچھ کوتاہیاں بھی رکھتے ہیں تو خدمتِ حرمین کے سلسلے میں ان کا ہر سال بڑھتا ہوا پروگرام اور توسیعات اور سہولتیں، بہرحال وجہ مسرت ہیں اور اب تو وہاں کی یونیورسٹی، طلبہ کی عالمی تنظیم، تعلیم کے لئے ملکیوں کے علاوہ غیر ملکی مسلمانوں کے لئے انتظامات، لائبریریاں، دینی و علمی خدمات کا سالانہ فیصل ایوارڈ عام معاشرے میں لوٹ مار اور خیانت و فریب کی روش کا نہ پایا جانا اور جرائم کا دنیا بھر سے کم ہونا۔ ایسے مسلم ملک کے متعلق کسی دوسرے مسلم ملک کے طالع آزما مجذوب لیڈر کا جنگ کی دھمکیاں دینا سخت افسوسناک ہے۔ صدام نے پہلے ایران سے لڑ کر، پھر کویت کو فتح کر کے اور پھر سعودی عرب کو دھمکی دے کر گویا پورے عالمِ اسلام پر وحدت اور امن کے امکانات کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔

ایسی صورت میں جبکہ سعودی عرب نے ایک جنگجو ملک کی حیثیت سے تو کجا، مناسب دفاعی تیاریوں کی بھی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ اسے اگر خطرناک صورت پیش آجائے تو وہ کیا کرے؟

امریکہ، روس اور مغرب کے کسی ملک سے امداد طلب کرے تو آپ آیت سنائیں گے کہ لا تتخذوا الیہود..... الخ پھر کیا پاکستان اس پوزیشن میں ہے کہ اس کی مدد کرے؟ ہم تو خود محولہ آیت کے انتباہ کے باوجود امریکہ، فرانس، آسٹریلیا، جرمنی اور جاپان سے سامان اور نقد امداد لیتے ہیں۔ کیا مصر اسے کام دے سکتا ہے؟ سوڈان؟ عمان؟ انڈونیشیا؟ ملائشیا؟ ایران؟ شام؟ وہ کسے پکارے۔ آپ کے گھر جب آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کے لئے آس پاس رہنے والے یہود و نصاریٰ تک کو نہیں پکاریں گے کہ دوڑیو، آگ بجھوالو، کیا ہندوؤں اور سکھوں کو نہیں بلوائیں گے کیا تلاش کریں گے کہ کوئی مسلمان ملے تو اس سے مدد لیں۔ چاہے وہ خود صاحبِ فراش ہو۔

دلی دوستی اور قلبی تعلق ہمیشہ ہم فکری اور ہم مقصدی سے پیدا ہوتا ہے لیکن دنیا کے بے شمار کام قلبی تعلق کے بغیر بھی چلتے ہیں۔ کوئی بیمار کسی سے مدد طلب کرتا ہے، کوئی کسی سے بوجھ اٹھوانے کے لئے کہتا ہے، کوئی کاروبار میں کسی سے لین دین کرتا ہے، کوئی کسی کا ہم سفر بنتا ہے تو کئی کام اس کے کر دیتا ہے اور کئی امور میں اس سے مدد لیتا ہے۔

یہ نکتہ آپ نے عجیب لکھا ہے کہ تیل کی جو دولت ہے وہ شاہ فہد کی ملکیت نہیں (جی ہاں، اسی لئے خطرہ ہے کہ اب اس کے آزادانہ اقتدار میں نہ رہے) مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں جو سوئی گیس پیدا ہوتی ہے یا ایران سے تیل نکلتا ہے یا مصر میں کپاس کی پیداوار ہوتی ہے وہ کب کسی شاہ یا آمر یا جمہوری صدر یا وزیر اعظم کی ملکیت ہوتی ہے؟ لیکن جب بھی کسی قوم پر جنگ کی آزمائش آجاتی ہے تو اس کی ساری پیداواریں جو دولت فراہم کرتی ہیں وہ دفاع پر خرچ ہوتی ہیں۔ اس وقت کی وقتی ضرورتوں کو چھوڑ کر تیل اور مسلم ممالک کی پیداواریں اور ان سے حاصل ہونے والے سرمایہ کے صحیح استعمال کا خاکہ الگ سے سوچنا ہے اور اس کے لئے کچھ دیر محنت کر کے فضا تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر کسی کے پاس اسلحہ کم ہو تو اس کے حصول کے لئے وہ قومی خزانے کو استعمال کریگا اور اگر سپاہ کم ہو تو لازماً کرائے کے سپاہی (MERCENRIES) یا بالمعاوضہ مکمل فوج حاصل کرنی پڑے گی۔ ورنہ اگر آپ شاہ فہد کو اس بات کا پابند کر دیں کہ تیل کی دولت کو تم اپنی دفاعی طاقت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تو پھر نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ صدام صاحب کا ہتھوڑا چلے اور صفایا کر دے۔ یہاں تک کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں حرمین اور سرزمین حرمین کی مکمل تباہی اور توہین ہو۔ پھر یہاں بھی صدام کی حکومت آجائے، سب کچھ لوٹے، توڑے پھوڑے اور سعودی عرب کو بھی صوبہ بنا کر ضم کر لے۔ پھر چاہے وہ سعودی عرب کے تیل کی دولت کو اپنے اور کویت سے چھینے ہوئے تیل کی دولت کے ذریعے من مانے طریق سے عالمِ اسلام کی تباہی اور وحدتِ اسلامی کے خواب کو پریشان کر کے چھوڑے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ کی خاص زد شاہ فہد پر پڑی لیکن اور کسی آمر یا سلطان یا صاحبِ ولایت فقیہہ پر نہ پڑی کہ اس کے ہاں جو تیل کی یا دوسری دولتیں جمع ہیں وہ ان کو خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ یا تو یہ اصول سب کے لئے سامنے لائیں اور سب سے منوائیں یا خاص شاہ فہد کو نشانہ بنانے کی جانبدارانہ روش سے پرہیز کریں۔

پھر اسی ضمن میں مائدہ کی آیت ۶۴ سے آپ کا استدلال کہ یہودی جب بھی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتے ہیں۔ جی ہاں انہوں نے فلسطینی عربوں کو کھدیڑنے کی آگ بھڑکائی اور وہ بجھ گئی۔ پھر انہوں نے عرب علاقے ساتھ ملا لئے تو وہ آگ بجھ گئی۔ اب عراق کی زد سے بچنے کے لئے ایک آتشیں جنگ کا شعلہ بھڑکوا کر کویت کو بھسم کر دیا اور اب وہ آگ بھی پھر بجھ گئی۔

یعنی آیت سے یہ مطلب نکالنا کہ یہودیوں کی لگائی ہوئی ہر آگ خود بخود بجھتی رہے گی تمہیں پریشان ہونے اور انتظامات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس آیت کو آپ ازسرِ نو سمجھنے کی کوشش کریں۔

۶۔ اس گفتگو کے باوجود میں آیت "۱۸ لا تتخذوا الیھود... الخ" کے بنیادی

سبق کی طرف بھی توجہ کرتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایمان، خودی اور ملّی غیرت کا تحفظ بغیر اس کے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ :

ا: وہ باہم وگر چند اصول و مقاصد خود اپنے دین سے اخذ کر کے ان پر متحد ہوں نہایت ہی قابلِ شرم مقام ہے کہ ان کے دشمن کس آسانی سے وقت کے کسی بھی مسئلے پر اپنا متفقہ راستہ نکال لیتے ہیں یہاں تک کہ سلمان رشدی تک کے معاملے میں ان کا ایکتا سامنے ہے جس کی بنیاد بڑی مجہول ہے۔

لیکن مسلمانوں میں صدیوں سے یہ بیماری لگ گئی ہے کہ بہت سے ملکوں کا اتحاد تو کجا، کسی ایک ملک کی جماعتوں اور نسلوں اور صوبوں کا آپس میں اتحاد نہیں ہو سکتا خود کسی ایک گروہ میں پوری طرح وحدت نہیں پائی جاتی بلکہ ہر جماعت یا گروہ چند سالوں میں دو حصوں میں بٹ جاتا ہے پھر آگے چل کر اور نئی شاخیں نکل آتی ہیں۔

عقل حیران ہے کہ بے اتفاقی کی وجہ سے تاریخ میں بار بار ماریں کھا کر بھی ہمیں ہوش نہیں آسکتی۔ وہ اہم قوت جسے دوسری قوتیں محض عقل سے دریافت کر کے اس کی پابندی کرتی ہیں۔ ہم ایمان رکھنے والے لوگ ان سے بھی نمونہ نہیں لے سکتے۔

ب: دوسری اشد ضروری چیز یہ ہے کہ حکمرانوں اور عوام کا رشتہ اسلام کے شورائی نظام نے جس طرح استوار کیا ہے اس کا نقشہ مرتب کرنے کے لئے ایک وسیع کمیٹی علماء اور دانش وروں پر مشتمل مقرر کی جائے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق اور خلفائے راشدین کے اسوہ کے مطابق صحیح اسلامی نظام حکمرانی کو طے کرے اور سارے مسلم ممالک اس کی پابندی کریں۔ اس طرح مغربی افق پر سیاست کے لادین تصور سے ہمیں نجات بھی ملے گی اور معاشرے بھی زیادہ محکم اور خوشحال ہوں گے۔

ج: یہ بھی اشد ضروری کام ہے کہ زندگی کی تقریباً تمام ضروریات جو صنعت سے حاصل ہوتی ہیں۔ پن سے لے کر ہوائی جہاز تک وہ مسلم ممالک میں بننی چاہئیں۔

د: تمام ادویات میں ہمارے ممالک کو خود کفیل ہونا چاہیئے۔

س: اسلحہ سازی کا مکمل کام ہمارے اپنے ہاتھوں میں آجانا چاہیئے۔

س : مسلمان ملکوں سے کوئی سرمایہ باہر جا کر دوسروں کے کام آنے کے بجائے اپنے ممالک کے صنعتی، کیمیکل اور اسلحہ جاتی کاموں میں لگنا چاہیے۔

ص : پروپیگنڈہ کی پوری مشینری، علمی سطح سے لے کر صحافتی سطح تک ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے۔

ط : اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے ہمیں اپنا جداگانہ تشخص نہایت سختی سے قائم اور محفوظ رکھنا چاہیئے۔

ع : دولت کے جمع کرنے اور استعمال کرنے پر اس دور میں جو قباحتیں نمودار ہوئی ہیں۔ان پر قدغن لگانی چاہیئے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب لوگ متوسط کفالتی گزران کو باہمی آراء سے اپنے لئے لازم کر لیں۔

یہ کام اگر کریں تو پھر نہ صرف وہ آیت جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، بلکہ قرآن کی ساری آیات ہمارے گرد جھرمٹ کر کے ہمیں ایک ناقابلِ تسخیر چیز بنا دیں گی۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اور اگر یہ نہیں تو پھر سب کھیل تماشے ہیں۔فتوحات اور شکستیں ڈرامے ہیں، کامیابیاں اور ناکامیاں مذاق ہیں۔ یہ ساری چیزیں آخرت کے کھلیان میں سے اس طرح اڑ جائیں گی جیسے بھس۔

کیا بنے گا!

مضمون ختم ہوا مگر مجھے بہت دکھ ہے اس بات کا خلیجی ممالک کے مسلمان ہوں یا دور دراز کے، فرد ہوں یا ادارے، علماء ہوں یا اخبارات اس مسئلے پر بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ان کی کوئی لگی بندھی رائے نہیں۔ گویا قرآن و حدیث کی روشنی سے محروم ہیں۔ ایسی ملت کا کیا بنے گا؟ (ف ۔ ص)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

تنقید

تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اس حقیقت سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ہم نے عام انسانیت کی، اپنے ملک کی اور اپنی ملت کی خرابیوں پر تنقید کرنے میں جو آزادی برتی، اُسی آزادیٔ تنقید کو اپنی جماعت میں بھی برقرار رکھا تاکہ جماعت کے اندر جہاں جو خرابی بھی موجود ہو، اس کی بروقت نشاندہی ہو جائے اور اُسے دُور کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ جماعت کے ہر شخص کو محض تنقید کا حق ہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ کسی خرابی کو محسوس کر کے خاموش نہ رہ جائے۔ یہ بات ہر رُکن جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل ہے کہ اپنے ساتھی ارکان کی ذات میں، یا ان کے جماعتی کردار میں، یا اپنی جماعت کے نظم میں، یا جماعت کے لیڈروں میں اگر کوئی نقص پائے تو اسے بلا تکلف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی بنایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف تنقید کو برداشت کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور جس نقص کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اگر واقعی موجود ہو تو اُسے دُور کرنے کی طرف توجہ کریں، ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کر دیں۔

(اقتباس از جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل ص ۶۵)

دینی جدوجہد کا اصل محور

جناب سید محمد صمیم پاشا صاحب

(۲)

اخلاقی و معاشرتی نوعیت کی خرابیاں تو ایسی ہیں کہ معاشرے میں جاری و ساری ہونے کے باوجود ان کی ناپسندیدگی پر ایک رائے عام پائی جاتی ہے۔ جھوٹ، رشوت، چوری، فحاشی، بے رحمی وغیرہ کو یوں بھی دنیا کے عام اخلاق میں بُرا ہی سمجھا گیا ہے، کجاکہ "مذہبی دلیلوں" سے ان کی حمایت میں لڑا ئی۔ یہ بُرائیاں تو ایسی ہیں کہ صرف ان کی نشان دہی بھی عیب کشا ہوتی ہے۔ اُن کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کو معاشرے کی تائید بھی مل جاتی ہے، مگر شرکیہ تصورات و اشغال کی نوعیت ایسی نہیں ہے۔ یہ بُرائیاں خاص مذہبیت ہی کا جامہ زیب تن کر کے دین میں داخل ہوتی ہیں۔ انہیں کارِ ثواب اور قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے، اُن کے خلاف بولنے والوں کے مقابلہ پر خود مذہبی ذوق رکھنے والے عناصر ہی کمربستہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی حقیقت کھولنے اور لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے زیادہ محنت کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ توجہ کی بھی۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ تمام جرائم میں سرِفہرست اسلام نے کس کو رکھا ہے؟ کون سا حکم دے کر دوسرے احکامات دیئے ہیں؟ کس نقص کی اصلاح کے بعد دوسرے نقائص پر توجہ دی ہے؟ اور کس قصور کی بنا پر اعمالِ صالحہ کا دفتر بھی ردّی ٹھیرے گا؟ وہ گناہ آخر کیا ہے جس کو ظلمِ عظیم، کلمہ خبیثہ اور ضلال بعید جیسے

حقیر نام دیئے گئے اور جن کے مرتکبین کو شر البریہ کا لقب دیا گیا؟ کیوں ایک شخص رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہو کر بھی بروز محشر آپؐ کی شفاعت سے محروم رہے گا؟ اور معصیت کی وہ کیا نوعیت ہے جس کے لیے بار بار خلود فی النار کی وعید سُنائی گئی ہے؟ پھر ایک شخص شرابی یا چور یا رشوت خور یا فاحش ہونے کے ساتھ ساتھ بدعقیدگی کا بھی شکار ہو اور اس کا ایمان نظری اعتبار سے بھی نادرست ہو تو اس کی خیر خواہی کا تقاضا دینِ حق کیا بتاتا ہے؟ کس نقص کے باوجود اس کی آخرت میں نجات ممکن ہے اور کس کے ہوتے ہوئے اُس کے اعمالِ صالحہ بھی اُس کو فائدہ نہ دیں گے؟ ایک داعی کو اوّلین توجہ کس پہلو کی اصلاح پر دینی ہو گی؟ ــ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک سنجیدہ مطالعہ بھی فکرمند کر دینے کے لیے کافی ہے، کیونکہ اسلام جس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ توجہ طلب قرار دیتا ہے، اسی کی طرف سے ایک عام سُستی اور کاہلی ہے، بے حسی اور اغماض ہے، بے رخی اور عدم دلچسپی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ((اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور اس کے سوا دوسرے گناہ جس کو چاہے بخش دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ نساء)

ایک دوسری غلط فہمی جو دراصل اوّل الذکر ہی کا ایک شاخسانہ ہے، یہ پھیلی ہوئی ہے کہ "چونکہ عقیدے کی غلطیوں کو سمجھانا تو ایک کارِ دارد ہے، اکثر لوگ بات نکلتے ہی کترا کر نکل جاتے ہیں، ورنہ تاویلیں دینے لگتے ہیں، اُلجھ پڑتے ہیں، مان کر نہیں دیتے۔ البتہ اُلٹا اس خیر خواہی کو دشمنی پر محمول کرتے ہیں تو آخر یہ بھی کیا حکمت ہے کہ پہلے مرحلہ ہی پر اس موضوع کو اُٹھایا جائے؟ کیوں نہ ابتداءً ایسے اُمور کو لیا جائے جو متفقہ ہیں، جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں، جن کو ہر شخص سمجھتا ہے، جس سے اختلاف کی مجال کسی کو نہیں؟ اور پھر تبلیغ کی حکمت بھی تو عین

یہی ہے کہ پہلے قدرِ مشترک کو بیچ میں لا کر بات آگے بڑھائی جائے۔ اس "حکمت و مصلحت" کے ذیل میں قرآن مجید سے ایک آیت کا جزو بھی برائے تنبیہ، سنایا جاتا ہے: قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (آل عمران) "کہو، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔"

حالانکہ درست نتیجہ اسی آیت کو پورا پڑھ دینے سے نکل آئے گا، جس میں محولہ جزو کے معاً بعد بہ صراحت موجود ہے: أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران) (یہ کہ ہم اپنے اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے)۔ دیکھا تو جائے کہ اس آیت میں کون سی ایسی بات ہے جو اہل کتاب اور اہل ایمان کے مابین "متفق علیہ" تھی؟ آیا یہ کہ اہل ایمان کی طرح یہود و نصاریٰ بھی اِلٰہ واحد کی بندگی پر راضی تھے؟ یا یہ کہ وہ بھی اسلامی عقیدے کے مطابق عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول ہی مانتے تھے؟ یا یہ کہ وہ نظریہ تثلیث کے مخالف تھے اور مسیحؑ کو اللہ یا ابن اللہ نہیں کہتے تھے؟ اپنے علماء کو شریعت سازی کا مجاز نہیں سمجھتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں جس قدرِ مشترک کا ذکر ہے۔ وہ طریقین کے درمیان، صرف داعی ہی کے لیے تسلیم شدہ مگر مدعو کے لیے محض واجب التسلیم کے درجہ میں تھی۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہر دو گروہ دوسری ہزاروں برائیوں کے ساتھ ساتھ شرک کی بیماری میں مبتلا تھے جب کہ اُن کے انبیاء نے بھی اسی مرض سے اُن کو بچانے کے لیے سب سے زیادہ محنت کی تھی۔ ان کو بھی اسی دین کی تبلیغ کی گئی تھی جو آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا جس کا پہلا درس ہی اخلاص بندگی ہے اور دراصل یہی وہ بھولا ہوا سبق تھا جو ترتیبِ دعوت کے مطابق سب سے پہلے انہیں یاد دلایا گیا۔

پھر عام اس سے کہ اب کتنے مسائل اس اُمت میں اختلاف کی آماجگاہ بننے سے رہ گئے ہیں۔ اور اُمت کے باطل پر جمع نہ ہونے کی پیش گوئی برحق، مگر ایجاباً ایسے اتفاقی اُمور کی تعداد کیا ہے جنہیں قوم کا ہر طبقہ مان رہا ہے، اور دین ایک، خدا ایک، نبی ایک، کتاب ایک کہنے کے بعد کتنے قدم ملا کر صحیح سمت کی طرف اُٹھائے گئے ہیں؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آج جن مسائل کو " متفقہ " اور " ہر گروہ کے نزدیک تسلیم شدہ " کہہ کر ان کی جو اشاعت دین کی اس بنیادی تعلیم کے مقابلہ میں نمایاں کی جا رہی ہے، نوعیت کے اعتبار سے کس درجہ کی ہیں؟ وہ دین کا اصل ہیں یا اُس کا فروع؟ مبادیات ہیں یا اُن کے تقاضے؟ بنیادیں ہیں یا اُن پر اُٹھائی جانے والی دیواریں؟ اگر ان کی نوعیت پہلی نہیں، بلکہ دوسری ہے تو پھر وہ جڑ کہاں ہے جس پر یہ بار شجر آئے گا؟ وہ بنیاد کدھر ہے جو دیواروں کا بوجھ سہارے گی؟ یہ پھول، بوٹے اور شاخیں کس اصل سے پیوست ہوں گی؟ کیا اسلام کی بھی قلم لگائی جائے گی؟ یا سنت اللہ آج کے زمانے میں آکر بدل گئی ہے کہ پھل، پھول اور ڈالیاں پہلے آگیں گی اور جڑ بننے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ آخر کب تک ایمانیات کے بنیادی مسائل کو "اخلاقی مسئلہ" کہہ کر ثانویت کا درجہ دیا جائے گا؟ اور کہاں تک " حکمت و مصلحت " کے نام سے کتمانِ حق اور رعایتِ باطل کے بوجھ لادے جائیں گے اور " تدریج " کی اصطلاح، دین کی ترتیب اُلٹ کر، اس کی جدوجہد کے لیے استعمال ہو گی۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ اللہ کا دین کیا اس قدر مظلوم اور ایسا ہی مسکین ہے کہ اس کا ابلاغ لوگوں کی اجازت پر موقوف ہو؟ کیا شہادتِ حق کا ایسا ہی کچھ تقاضا ہے کہ دین کے انہی اجزا کو نشر کیا جائے جو عوام کو گوارا ہوں؟ کیا بندوں کی ناراضگی کی ایسی بھی کوئی قیمت ہے کہ اس کے مقابلے پر اللہ کی ناراضگی مول لے لی جائے؟ اگر دینِ حق کے احقاق کے لیے ایسی ہی لوچ دار تبلیغ کافی تھی تو یہ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب)

(باقی بر صفحہ ۷۴)

نماز

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

(۳)

قیامت کے روز پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا

قیامت کے روز نماز ہی انسانی اعمال کا معیار و میزان ہوگی۔ اگر نماز صحیح ٹھہری تو نجات ہے اگر نہیں تو پھر سراسر نقصان ہی نقصان۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز بندے کا سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔ اور اگر نماز صحیح ٹھہری تو فلاح و نجات پا جائے گا۔ اگر نماز خراب نکلی تو تباہ اور خسارہ پانے والوں میں ہو جائے گا۔ اگر فرض نماز میں کمی ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ میرے بندے کی نفلی نمازوں کو دیکھو اور فرائض میں جو کمی رہ گئی ہو، وہ نوافل سے پوری کرو۔ پھر اس کے باقی اعمال کا فیصلہ بھی اسی اصول پر کیا جائے گا"[1]

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسشِ نماز بود

[1] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۵۵

نماز جس طرح آخرت میں فلاح و کامیابی کا ذریعہ ہے اور جس طرح ہماری انفرادی زندگیوں کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح جسمِ ملّت میں اجتماعیت کی رُوح پھونکنے اور اُمّتِ اسلامیہ کے متفرق موتیوں کو ایک لڑی میں منسلک کرنے کا نسخہ بھی یہی نماز ہے۔

جماعت اور اس کی اہمیت و فضیلت

فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔ اور اسلام میں نماز کا مزاج اور اس کی صحیح شکل اسی میں ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ[1]

"رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ اس پر اس طرح مداومت کرتے تھے کہ گویا وہ بھی نماز کا جزاور نماز کے اندر داخل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

"جس کی خواہش ہو کہ کل (قیامت کے روز) وہ اللہ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے۔ اسے چاہیے کہ ان نمازوں کو پابندی سے وہاں مسجد میں جماعت سے ادا کرے، جہاں سے ان نمازیوں کے لیے ندا یعنی اذان دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبیؐ کے لیے ہدایت کے طریقے مقرر کیے ہیں۔ اور یہ نمازیں ان ہدایت کے طریقوں ہی میں سے ہیں۔ اور اگر تم اس جماعت سے پیچھے رہ جانے والے کی طرح ہو جو گھر میں نماز پڑھتا ہے۔ گھروں میں نماز پڑھو گے تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو چھوڑو گے، اور اگر تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو چھوڑو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص بھی اچھا وضو کر کے ان مساجد میں سے کسی مسجد کی طرف جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے اس کی ایک نیکی لکھتا ہے، ایک درجہ بڑھاتا ہے اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور

---

[1] البقرہ - ۴۳

ہم (صحابہؓ) دیکھتے تھے کہ نماز باجماعت سے غیر حاضر صرف ایسے ہی اشخاص ہوتے تھے، جن کا نفاق معلوم اور مُسلّم ہوتا تھا۔ اور یہ حالت بھی ہم نے دیکھی تھی کہ ایک شخص (بیماری کی وجہ سے) دو آدمیوں کے درمیان میں گھسٹتا ہوا لایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ صف کے درمیان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جماعت چھوڑنے والے پر سخت نکیر فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو بعض نمازوں میں نہ پایا۔ تو فرمایا کہ میرے جی میں آتا ہے کہ کسی شخص کو لوگوں کو نماز پڑھانے کا حکم دوں۔ پھر خود ان لوگوں کی تلاش کروں جو جماعت کے نماز سے بیٹھے رہتے ہیں۔ (یعنی نماز میں نہیں آتے) پھر حکم کروں کہ لکڑیوں کے گٹھوں سے ان کے گھر جلا دیئے جائیں اور اگر ان میں سے کسی کو یہ معلوم ہو کہ اُسے چکنی چرب ہڈی (جیسی حقیر) چیز بھی ملتی تو دُنیاوی فائدے کی لالچ کی وجہ سے) ضرور (عشاء) کی نماز میں آتا۔[2]

قرنِ اول میں ترکِ نماز بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک فتویٰ جامع ترمذی میں نقل کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکِ جماعت بہت بڑا گناہ ہے۔

قال مجاهد وسئل ابن عباس عن رجل يصوم النهار ويقوم الليل لا يشهد جمعة ولا جماعة فقال هو في النار[3]

"مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے ایسے شخص کی نسبت پوچھا

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۳۱، سنن نسائی جلد ۱ ص ۱۲۵۔
[2] صحیح مسلم [3] جامع ترمذی۔ باب ما جاء فیمن سمع النداء فلا یجیب۔

گیا۔ جو دن کو روزہ رکھتا ہے، رات کو قیام کرتا ہو اور جمعہ اور جماعت میں حاضر نہ ہوتا ہو! آپ نے فرمایا وہ آگ میں ہے۔ یعنی جہنم میں جائے گا۔

نماز باجماعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت سی نازک حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں۔

ان فوائد اور حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جب بہت سے مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اُمید کا دامن تھامے ہوئے خوف سے بھرے ہوئے سر تسلیم خم کیے ہوئے جمع ہوتے ہیں۔ تو اُن کے اس اجتماع کی وجہ سے برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ رحمتیں اُترتی ہیں اور ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہیں۔ استسقاء کی اجتماعی دعا، جمعہ و جماعت اور حج کے اجتماعات کا راز یہی ہے[۱]

نماز باجماعت کے ساتھ ساتھ صفوں کی درستگی بھی لازمی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

سوّوا صفوفکم فان تسویة الصفوف من اقامة الصلوٰة[۲]

اپنی صفوں کو برابر کرو، اس لیے کہ صفوں کی برابری اقامتِ صلوٰۃ میں داخل ہے۔

نماز اور مسجد کا اسلامی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر میں جو حصہ ہے، اس کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) نے بڑے اچھے پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ علامہ مرحوم لکھتے ہیں۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۲۰

[۲] بخاری و مسلم

کا اوّلین شعار اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے۔ اس کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اس کی گرہ کھل جانے سے ان کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی۔ جس طرح آج ہم جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعین کے لیے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح جب مسلمان زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اس کے زیر نظر ہوتی تھی۔ ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا۔ وہی بیت المال تھا۔ وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدے کے لیے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلافِ باہمی کو تہہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی رسی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے۔ اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرلشکر مان کر ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے۔ اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی نظم و جماعت، اطاعت پذیری اور وحدتِ قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے۔ اسی لیے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں۔ اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے۔ نہ انقیاد امامت ہے، نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے۔ اسی بنا پر داعیٔ اسلام علیہ السّلام نے یہ فرمادیا۔

العهد الذی بیننا وبینهم الصلوٰة فمن ترکها فقد کفر

(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

(ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اس کو چھوڑا۔ اس نے کفر کا کام کیا)

نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان، شراب بے نشہ، اور گل بے رنگ و بُو ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اُس سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اسی لیے نماز اسلام کا اوّلین شعار ہے۔ اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے[1]

نماز میں لوگوں کے مختلف مراتب ہیں

نماز میں لوگوں کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک کی نماز کو دوسرے کی نماز پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے ارفع و اعلیٰ اور خدا کی میزان میں سب سے زیادہ وزنی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی نماز آپ کی نماز کے زیادہ مشابہ اور قریب تھی۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضِ وفات میں حضرت صدیق اکبرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم فرمایا[2]۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

"لوگوں کے درجہ اور مرتبہ کا صحیح اندازہ نماز سے جتنا ہو سکتا ہے اتنا کسی اور چیز مثلاً علم، ذہانت اور کسی علمی خدمت سے نہیں ہو سکتا۔ نماز ہی وہ صحیح پیمانہ ہے جس پر انسان کے دین کا اور اسلام میں اس کے مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں جن شخصیتوں کا نام زندۂ جاوید ہے اور جو اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز نظر آتی ہیں۔ ان کو یہ مرتبہ و مقام اور یہ بقاء دوام اسی نماز میں امتیاز و خصوصیت پیدا کرنے اور اس کے درجۂ احسان تک پہنچنے سے حاصل ہوا ہے[3]

[1] سیرۃ النبی طبع ہفتم ۱۹۴۷ء اعظم گڑھ ص ۱۳۹ - ۱۴۰۔
[2] صحیح بخاری۔ [3] ارکانِ اربعہ ص ۱۲۶۔

ملتِ اسلامیہ کی بقاء اقامتِ صلوٰۃ میں ہے

ملتِ اسلامیہ کی بقاء و ترقی اقامتِ صلوٰۃ میں ہے، اور تنزل و اضمحلال اضاعتِ نماز میں ہے۔ نصِ قرآنی اس پر شاہد و عادل ہے کہ نمازوں کی بربادی اقوام و ملل کی بربادی کا بڑا سبب ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (مریم - ۵۹)

پھر ان کے بعد (بعضے) ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا۔ اور (نفسانی ناجائز) خواہشوں کی پیروی کی سو یہ لوگ (عنقریب) خرابی دیکھیں گے۔

اب ضروری ہے کہ اُمتِ اسلامیہ جس کی اکثریت نے اس بڑے فریضہ کو بھلا دیا ہے انہیں پھر مساجد کی طرف لایا جا سکے تاکہ ان کی گرتی ہوئی ساکھ دوبارہ بحال ہو جائے۔ اگر اُمتِ اسلامیہ نے اس طرف دھیان نہ دیا۔ تو پھر سوائے ذلالت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جس نے ذکر سے روگردانی کی، اس کا انجام اچھا نہیں ہے

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

معذرت ——— (شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۹۰ء)

مضمون انکارِ شریعت کے مضمرات کے ساتھ صاحبِ مضمون کا نام محمد اکرم طاہر چھپنا چاہیئے تھا، غلطی سے محمد اسلم طاہر چھپ گیا ہے۔ ہم جناب محمد اکرم طاہر صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔ قارئین اپنے اپنے رسالوں میں نام کی درستی کر لیں۔ (ادارہ)

رسائل و مسائل

ازواجِ مطہرات کے متعلق ایک نازک بحث

سوال : آپ کی توجہ ایک انتہائی اہم اور حساس موضوع کی طرف مبذول کی جارہی ہے - براہ کرم دینی فریضہ سمجھتے ہوئے اس مفسدہ کا سدِ باب کریں - ماہنامہ "الدراسات الاسلامیہ" عربی جو کہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے - اس میں محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۰ھ (دسمبر ۱۹۸۹ء) کے شمارہ میں ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے :

هل خالف النبی علیه الصلوٰة والسلام اوامر الایة .....
مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؟

(کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی جس میں دو، تین، چار خواتین سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے ؟)

اس سوال میں بڑے نازک مگر سنگین مسئلے کو اٹھایا گیا ہے -

اس موضوع پر خامہ فرسائی فرماتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ آنحضورؐ نے قرآن کے مطابق صرف چار بیویوں سے ازدواجی تعلقات رکھے تھے اور باقی پانچ ازواجِ مطہرات کو صرف اعزازی بیویاں بن کر رہنے کی اجازت تھی جن کے فی الحقیقت کوئی حقوقِ زوجیت نہیں تھے - اس طرح ڈاکٹر صاحب نے امہات المومنین کی دو قسمیں بنا ڈالیں : اصل بیوی اور اعزازی بیوی - اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ فتنہ ہے تو اس کا سدِ باب لازم ہے - آپ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائرکٹر صاحب

کو بھی متنبہ کریں کہ ایسے لغو نام نہاد تحقیقی مضامین مت شائع کریں ۔ تراشہ ارسالی ہے۔"

جواب :- میں نے اس خط کے ساتھ مرسلہ تراشہ بھی دیکھا اور پھر شمارہ کا پورا مضمون نکال کر غور و احتیاط سے پڑھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا مضمون ایسے مواد پر مشتمل ہے کہ یہ باور کرنا محال ہے کہ یہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تراوشِ قلم ہو سکتا ہے ۔ اس مقالے پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس کے ضروری اجزا کا ترجمہ پیش کر دیا جائے ۔ اس مضمون کا عنوان مع ترجمہ تو اُوپر نقل ہو چکا ہے ۔ اب اس کی مترجم تلخیص درج ذیل ہے ۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

"جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو تھوڑے عرصے کے بعد سورۃ النساء نازل ہوئی جس میں حکم دیا گیا :..... "عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہو، نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار..... (النساء ۳) ظاہر آیت سے اباحت نکلتی ہے ، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر تحدید کے معنی میں فرمائی ہے ۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جن کے نکاح میں چار سے زاید بیویاں ہوں، وہ زاید کو طلاق دے دیں ۔ پس جن صحابہ کرامؓ کے نکاح میں زاید بیویاں تھیں، انہوں نے طلاق دے دی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت تو ۹ ازواج تھیں ۔ آنحضورؐ نے اس تحدید پر عمل نہیں فرمایا ۔ کیا آپ کے معاملے میں کوئی اختصاص تھا ؟ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ قرآن مجید میں اس مسئلے میں آنحضورؐ کے لیے بعض خاص ازواج کو حلال فرمایا گیا ۔ خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (الاحزاب - ۵۰)..... (یہاں بیان کردہ عورتیں خاص طور پر تمہارے لیے حلال ہیں، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں.....)

(پھر ڈاکٹر صاحب اس سوال و جواب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،)

ام شیء آخر ؟ کیا یہ آنحضورؐ کے لیے اختصاص تھا یا کوئی دوسری صورت تھی ؟ پھر لکھتے ہیں :

"اس مسئلے کی اہمیت بدیہی ہے۔ میں نے اس پر طویل مدت تک غور کیا اور کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اگرچہ ابھی تک مجھے کوئی صراحت نہ مل سکی، لیکن کافی اشارات ملے اور ایسا مواد فراہم ہو گیا جس سے بلا تامل استنباط ممکن ہے۔"

پھر ڈاکٹر صاحب قدم آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت تحدید کے فوراً بعد آپؐ نے ازواج مطہرات کو یکے بعد دیگرے مطلع فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک مسلمان کو چار بیویوں سے زاید کی اجازت نہیں دیتا اور آپؐ پر واجب ہے کہ نو ازواج میں سے چار کو طلاق دے دیں، لیکن آپؐ کا ارادہ یہ نہیں کہ آپؐ اپنے طور پر کسی بیوی کو بھی طلاق دیں جب تک کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو۔ اس لیے حضورؐ نے مطالبہ فرمایا کہ ازواج اپنے آپ ان چار کا انتخاب کر لیں جو آپ کے حبالۂ عقد میں رہیں اور بقیہ کونسی پانچ ازواج ہوں جن سے مفارقت ہو اور ان کے لیے تادمِ حیات کفالت کا انتظام ہو؟

اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ ازواج میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ ہو گی کہ وہ آپؐ سے جدا ہو اور ایک مسلم خاتون کیسے چاہے گی کہ وہ اُمّ المومنین اور زوجۂ مطہرۂ نبی کے رتبے کو خیر باد کہہ دے؟"

اب میں ڈاکٹر صاحب کے فرموداتِ بالا پر اپنی گذارشات بالاختصار پیش کرتا ہوں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سورۃ النساء آیت نمبر ۳ کے نزول کے وقت ازواجِ مطہرات کی تعداد نو تھی۔ اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت غزوۂ احد کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہے۔ جب کہ صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد نے جامِ شہادت نوش فرمایا، اور یتامیٰ، بیوگان کے نکاح و وراثت کے متعدد مسائل اچانک پیدا ہو گئے۔ غزوۂ احد شوال ۳ھ میں پیش آیا۔ اُس وقت حرمِ نبوی میں چار درج ذیل

ازواجِ مطہرات موجود تھیں:

حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہن۔

غزوۂ اُحد کے بعد جب سورۂ نساء کی ابتدائی آیات نازل ہوئی ہیں، اُس وقت بالیقین حرمِ نبوی انہی چار ازواج پر مشتمل تھا، ان میں سے حضرت حفصہؓ کے سابق خاوند حضرت خنیسؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ کے خاوند حضرت ابو سلمہؓ غزوہ اُحد میں شہید ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان ازواج کی دلجوئی اور دستگیری کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا۔ حضرت زینبؓ بنت جحش کا نکاح پہلے حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ہوا تھا لیکن مزاج کی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث طلاق ہو گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تالیفِ قلب کی خاطر ان سے نکاح غزوۂ احزاب اور محاصرۂ بنی قریظہ کے بعد شوال ۵ھ میں کیا، بلکہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے براہ راست حکم سے ہوا، کیونکہ سورۂ احزاب آیت ۳۸ کے الفاظ ہیں۔ زَوَّجْنَاكَهَا (ہم نے زینبؓ سے تمہارا نکاح کر دیا)، نیز فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (یہ کام اللہ نے نبیؐ پر فرض کر دیا)، جس سے ظاہر ہے کہ فرمانِ الٰہی کی تعمیل میں یہ نکاح غزوۂ اُحد کے دو سال بعد ہوا۔ جہاں تک حضرت زینبؓ بنت خزیمہ کا معاملہ ہے، ان کے خاوند حضرت عبداللہ بن جحش بھی غزوہ اُحد میں شہید ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد حضرت زینبؓ کی تزویج نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی، مگر آپ نکاح کے بعد فقط دو یا تین ماہ زندہ رہیں اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ سورۂ نساء کی آیت مذکورہ کے نزول کے وقت حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بقیدِ حیات تھیں یا نہ تھیں۔

بہرکیف ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ النساء کی آیت تحدید نازل ہوئی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت نو ازواج تھیں" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بقیہ ازواج (جن کا ذکر اُوپر نہیں آیا)، ان سب کا داخلہ حرمِ نبوی میں ۵ھ یا اس کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت جویریہؓ سے آپؐ کا نکاح غزوہ بنی المصطلق (غزوۂ مریسیع)

۵ھ میں حضرت زینبؓ بنت جحش کے نکاح کے بعد ہوا ہے۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ کا نکاح ۶ھ یا ۷ھ میں ہوا۔ حضرت صفیہؓ غزوہ خیبر ۷ھ کے موقع پر حرمِ نبوی میں داخل ہوئیں۔ اس کے بعد سب سے آخر میں ام المومنین حضرت میمونہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح عمرۃ القضاء ۷ھ میں ہوا۔ خلاصۂ بحث میرے نزدیک یہ ہے کہ جب آیت: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اُتری ہے، اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی تعداد چار تھی، البتہ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آنحضورؐ کے مزید نکاح کس حکمِ ربانی کے تحت منعقد ہوئے ہیں۔ اس سوال کا جواب بالکل آسان اور واضح ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے کی ابتدا میں تسلیم کر لیا ہے کہ چار سے زاید نکاحوں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اختصاص و استثنا عطا فرمایا تھا مگر اس اختصاص کی توجیہات و تشریحات کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے کاش کہ اس سے اجتناب واحتراز فرماتے۔ انھوں نے سورہ الاحزاب کے حوالے سے یہ تو بیان کر دیا کہ آنحضورؐ کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعض خاص ازواج کو حلال فرما دیا تھا۔ لیکن پھر یہ غیر ضروری لاطائل سوال اُٹھا دیا کہ: ھل ھذا الاختصاص له ....ام شیئ آخر؟ (کیا یہ آپ کے لیے اختصاص تھا .... یا کوئی اور بات تھی؟) اس کے بعد ان کی پوری بحث نے اس استفہام کو استفہامِ انکاری بنا کر رکھ دیا ہے۔

بلاشبہ سورۃ النساء کے نزول کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات چار ہی تھیں۔ سورۃ احزاب ۵ھ میں جب نازل ہوئی تو اس میں حضرت زیدؓ کی طلاق کا ذکر آیا اور یہ فرمایا گیا کہ حضرت زینب بنتِ جحش جنہیں طلاق ہوئی، ان کا نکاح ہم نے تم سے کر دیا۔ سورۃ احزاب کی آیت ۳۷، ۳۸ میں آنحضورؐ کے اس پانچویں نکاح کا جواز اور اس کی حکمت و مصلحت کا بیان بھی آ گیا۔ اس کے بعد الاحزاب کی آیت ۵۰ میں فرمایا گیا:

"اے نبیؐ ہم نے تمہارے لیے وہ بیویاں حلال کر دیں، جن کے مہر تم

نے ادا کر دیئے اور وہ عورتیں بھی جو تمہارے ملک میں آئیں اور تمہاری چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد خواتین جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کر دیا ہو، اگر نبیؐ اُس سے نکاح کرنا چاہیں۔ یہ اجازت و رعایت خالصتہً تمہارے لیے ہے، دوسرے مومنین کے لیے نہیں (خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ) پھر فرمایا:

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ۔

"ہم جانتے ہیں کہ عام مومنوں کے لیے ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں کیا کچھ مقرر کیا ہے (تمہارے لیے یہ خاص استثنا ہے)، تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے"۔

معلوم ہوا کہ آنحضورؐ کے چار نکاح تو سورۃ النساء کی تحدید کے مطابق تھے۔ مزید پانچویں نکاح اور بعض خاص قبیل کے مزید نکاحوں کی اجازت اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی ان آیات کی رُو سے کامل وضاحت وصراحت کے ساتھ آنحضورؐ کو فرما دی۔ اب اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے اس دعوت کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ سورۃ نساء کی آیت تحدید کے فوراً بعد نو ازواج کو کہے بعد دیگرے مطلع فرمایا کہ اب آنحضورؐ پر واجب ہے کہ نو میں سے چار کو طلاق دے دیں اور ازواج مطہرات آپس میں طے کرلیں کہ کون سی چار آپ کی زوجیت میں رہیں اور بقیہ پانچ سے جدائی ہو۔ یہ سرتاپا ایک غلط بے سروپا مفروضہ ہے جس کی کوئی اصل قرآن، حدیث یا کتب سیرت میں موجود نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب اس فرضی بنیاد پر مزید دو جاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یہ بات بدیہی ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کوئی ایک بھی مفارقت پر آمادہ نہ ہوئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ آپ اس مسئلے کو اس طرح حل کریں (کہ چار بیویوں کو نکاح میں رکھ کر پانچ سے مفارقت فرمالیں۔ اس کے بعد

دَعَا الله تعالیٰ فاوحی الیہ ان یبقی جمیعھن فی حبالۃ زواجہ بشرط ان لا یجامع الا اربعاً مِنھُنَّ فقبلن وفرحن لنعمۃ اللہ علیھن نعمۃ جدیدۃ۔ فاختار صلی اللہ علیہ وسلم اربعاً۔

"آنحضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی تو اللہ نے آنحضورؐ پر وحی فرمائی کہ آپ جملہ ازواج کو اپنے نکاح میں اس شرط پر رکھیں کہ ان میں سے فقط چار سے تعلق زن وشوئی رکھیں۔ ازواج مطہرات نے اسے قبول کر لیا اور نئی نعمت پر خوش ہوئیں جو اللہ نے ان پر نازل فرمائی، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کا انتخاب فرما لیا"۔

گویا ڈاکٹر صاحب کے بقول ازواج مطہرات تو اس نعمتِ جدیدہ پر فرحاں وشاداں ہوئیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات گراں گزری کہ ازواجِ مطہرات کو مجبور کیا جائے کہ وہ اہم ترین حقوق زوجیت کو خیرباد کہہ دیں۔ یہ امر آنحضورؐ پر شاق گزرا تو آپ نے اجتہاد کرتے ہوئے امراہون کو اختیار فرمایا۔ مگر آپؐ چار کی تعداد مباح میں وقتاً فوقتاً تبدل وتغیر کرتے رہے۔ مثلاً ایک مہینے میں ا، ب، ج، د سے تعلقاتِ ازدواجی کو استوار رکھا اور دوسرے مہینے میں ہ، واو، ز، ح سے تعلقات برقرار رکھے۔ لیکن مشیتِ الٰہی نے اس تغیر و تبدل سے موافقت نہ کی اور آنحضورؐ نے بالآخر ازواج مطہرات میں سے صرف چار کو جمیع اخلاقی ومادی حقوق کے لیے منتخب فرما لیا۔ اور یہی چار حقیقی معنوں میں ازواج (زوجات عادیہ) تھیں۔ اور بقیہ پانچ اگرچہ حبالۂ ازدواج میں رہیں۔ لیکن انہیں پورے حقوق زوجیت حاصل نہ تھے، وہ اعزازی بیویاں (زوجات شرف) ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تحدید کی خلاف ورزی نہیں کی جو سورۂ نساء کی آیت .... مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ میں مذکور ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے ازواج مطہرات کی یہ دو طبع زاد قسمیں وضع کی ہیں، جنہیں انگریزی زبان میں FULLFLEDGED اور HONOURARY کہا جائے گا۔

ازواجِ مطہرات کی یہ دوگونہ تقسیم نصوص قرآن و سنت سے صریحاً متصادم اور ہتک حرمِ نبوی کے مترادف ہے۔ اِس عجیب و غریب ادّعا کے حق میں ڈاکٹر صاحب نے جن آیات و احادیث سے استدلال کی سعی کی ہے، ان کا کوئی تعلق النساء کی آیت تحدید سے نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، الاحزاب سے حضرت عائشہ رضؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تخییر بین الازواج کا حکم دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: میں ایک بات تم سے کہنے لگا ہوں لیکن تم اس پر اپنے والدین سے مشورہ کرنے سے پہلے جلدی نہ کرنا۔ پھر آنحضورؐ نے آیتِ تخییر تلاوت فرمائی (جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اے نبیؐ اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تمہیں دُنیا اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں مال و متاع دے کر خوب صورت طریقے سے رُخصت کردوں اور اگر تمہیں اللہ اور اس کا رسولؐ اور آخرت کا گھر مطلوب ہے تو پھر اللہ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لیے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا: اس میں والدین سے مشورے کی کیا بات ہے، میں تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب ہوں، پہلی حدیث میں تو اتنا ہی ہے، مگر دوسری حدیث میں مزید یہ ہے کہ "دیگر ازواجِ مطہرات نے بھی وہی کچھ کہا جو میں نے کہا تھا۔" صحیح مسلم اور دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ نے نان و نفقہ کی تنگی کا شکوہ آنحضورؐ سے کیا تھا جس کے جواب میں یہ آیت اُتری تھی اور ازواجِ مطہرات سب نے آخرت کو دُنیا پر ترجیح دی تھی۔ احکام القرآن (ابن العربی) اور دیگر کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت تخییر کے نزول کے وقت آنحضورؐ کی ازواج چار ہی تھیں: حضرت سودہؓ، حضرت عائشہ رضؓ، حضرت حفصہ رضؓ اور حضرت اُمِ سلمہ رضؓ۔ اب ڈاکٹر صاحب اس واقعہ کا تعلق جس طرح سورۂ نساء کے اوائل سے جوڑ رہے ہیں اور اپنے ذہنی اختراع سے جو کہانی بنا رہے ہیں، اس کے کسی جزو کا علاقہ آیتِ تخییر

اور ان احادیثِ بخاری سے آخر کیسے جُڑ سکتا ہے؟

کتب حدیث و سیرت میں یہ امر نہایت صراحت و وضاحت سے مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخرین ایامِ وصال تک جمیع ازواجِ مطہرات کے لیے باری کے دن مقرر فرما رکھے تھے، جن میں کوئی تبدیلی یا تاخیر و تقدیم نہ ہوتی تھی۔ حالتِ مرض میں جب آپؐ کا قیام حضرت عائشہؓ کے ہاں تھا، تب بھی آپؐ بار بار دریافت فرماتے تھے کہ کل مجھے کس بی بی کے ہاں جانا ہے۔ جملہ ازواج عیادت کے لیے وہاں موجود تھیں اور سب نے پوری رضا سے اپنی باریاں حضرت عائشہؓ کو دے دیں، تاکہ آنحضورؐ کو زحمت نہ ہو۔ میں زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے بخاری شریف کی دو حدیثیں نقل کیے دیتا ہوں۔ کتاب النکاح کے شروع ہی میں باب کثرۃ النساء میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جو انہوں نے اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ کا جنازہ اُٹھاتے وقت بیان کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ زوجۂ نبیؐ کا جنازہ ہے، غیر ضروری حرکت و جنبش نہ دینا۔ پھر آخر میں فرماتے ہیں: فانہ کان عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسع کان یقسم لثمان ولا یقسم لواحدۃ۔ (نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات نو تھیں، جن میں سے آٹھ کی باریاں مقرر فرما دی تھیں، البتہ ان میں سے ایک حضرت سودہؓ کی باری مقرر نہیں تھی (انہوں نے اپنی خوشی و رضامندی سے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو تفویض کر دی تھی۔ (میں رسائل و مسائل حصہ ششم کے آخر میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر چکا ہوں)۔

حافظ ابن القیم نے اپنی تصنیف زاد المعاد فی ہدی خیر العباد جلد اوّل کے آغاز میں ازواجِ مطہرات کے مفصل حالات بیان کیے ہیں۔ فصل کے آخر میں فرماتے ہیں:

لا خلاف انہ صلی اللہ علیہ وسلم توفی عن تسع وکان یقسم
لثمان۔ عائشۃؓ وحفصۃؓ وزینبؓ بنت جحش وامّ سلمۃؓ وصفیۃؓ
وامّ حبیبۃؓ ومیمونۃؓ وسودۃؓ وجویریۃؓ

(اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت

ازواج مطہرات کی تعداد نو تھی، جن میں سے آٹھ کے لیے آنحضورؐ نے باریاں مقرر فرما رکھی تھیں۔ ازواج مطہرات کے اسماء یہ ہیں: عائشہؓ، حفصہؓ، زینبؓ بنت جحش، ام سلمہؓ، صفیہؓ، اُمّ حبیبہؓ، میمونہؓ، سودہؓ و جویریہؓ۔ محدثین اور اہل سیرت نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ غزوات میں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی زوجہ مطہرہ کو ساتھ لے جاتے تھے تو ان کے لیے قرعہ اندازی فرماتے تھے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

ڈاکٹر صاحب بار بار سورۂ احزاب کی آیت ۵۰، ۵۱ کے حوالے سے اپنی بات کو دہراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت سودہؓ حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت میمونہؓ کو الگ کر رکھا تھا اور حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ سے ازدواجی تعلقات برقرار رکھے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے اس ناروا و بیجا استدلال کا صاف سیدھا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا مختار و مجاز بنا دیا تھا کہ اپنی ازواج میں سے جنہیں چاہیں الگ رکھیں، جنہیں چاہیں اپنے ساتھ رکھیں۔ اور جنہیں چاہیں علیحدہ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلالیں، لیکن اس سے یہ کیسے لازم و ثابت ہوا کہ فی الواقع آنحضورؐ نے اس اجازت و رعایت سے فائدہ بھی اٹھایا، بعض ازواج سے تعلقات منقطع رکھے اور بعض سے تعلقات برقرار رکھے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اختیار میں اتنی وسعت و صوابدید عطا کیے جانے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تادمِ رحلت ان وسیع و ہمہ گیر اختیارات سے استفادہ نہیں فرمایا۔

صحیح بخاری، کتاب التفسیر میں اسی آیت (تُرْجِی من تشاء ....) کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ کا قول منقول ہے:

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یستاذن فی یوم المرأۃ منا بعد ان انزلت

ھذہ الآیۃ۔

(حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت تُرْجِيْ مَنْ تَشَاءُ..... کے بعد بھی باری جس زوجہ کی ہوتی تھی (اس میں کسی تبدیلی کے لیے) اس زوجہ سے اذن و اجازت لیتے تھے)

فتح الباری (شرح البخاری) میں اس آیت اور حضرت عائشہؓ نے اس کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے، اس کے تحت مختلف تاویلات بیان کرتے ہوئے آخر میں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: وظاھر ما حکتہ عائشۃ من استیذانہ انہ لم یرج احدًا منھن یعنی انہ لم یعتزل وھو قول الزھری: ما اعلم انہ ارجأ احدًا من نسائہ اخرجہ ابن ابی حاتم۔

(حضرت عائشہؓ کے اس قول سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ آیت کے بعد بھی ازواج سے اذن لے کر باریوں میں تبدیلی فرماتے تھے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بیوی سے ارجاء نہیں فرمایا تھا، یعنی کسی زوجہ سے عزلت و علیحدگی اختیار نہیں فرمائی تھی۔ امام زہریؒ کا قول بھی یہی ہے کہ "میرے علم میں نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی سے تعلقات منقطع فرمائے تھے۔ ابن حاتم نے اس قول کی سنداً تخریج کی ہے۔

ابن حجرؒ اس بحث کا خاتمہ یوں فرماتے ہیں۔ وعن قتادۃ اطلق لہ ان یقسم کیف یشاء فلم یقسم الا بالسویہ۔

(قتادہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کے تحت مطلق اور عمومی اجازت دی گئی تھی کہ آپؐ جس طرح چاہیں باریاں مقرر کر دیں لیکن آنحضورؐ نے اس معاملے میں مساوات اور برابری کا رویہ اختیار فرمایا۔)

سخت تعجب ہے کہ حضرت عائشہؓ اور ان دیگر ائمہ سلف کے متفقہ قول سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ابورزین یا محمد بن حبیب بغدادی

کے اس شاذ قول پر کیسے اعتماد کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت میمونہؓ سے تو کنارہ کشی کر لی تھی اور حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے ازدواجی روابط و تعلقات کو قائم رکھا تھا؟ ڈاکٹر صاحب خود اعتراف فرماتے ہیں کہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۰، ۵۱ میں بہ تصریح موجود نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس سبب سے بعض ازواج سے مفارقت کا ارادہ فرمایا تھا؟ پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ادنیٰ شک نہیں کہ اس کا تعلق مثنیٰ وثلٰث وربٰع والی آیت سے ہے۔ یا للعجب! میں کہتا ہوں کہ سورۂ احزاب کی آیت میں اس "مزعومہ مفارقت" کے نہ ارادے کا ذکر ہے، نہ سبب کا ذکر ہے، بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا، اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کی عائلی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے آپ کو ایک طرح سے کامل اختیارات دے دیئے کہ آپ ازواجِ مطہرات کی باریوں کے معاملے میں جو طرزِ عمل مناسب خیال فرمائیں، اختیار کریں مگر اس کے باوجود آنحضورؐ نے ہمیشہ پوری مساوات کو ملحوظ رکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے تفسیر طبری کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ آنحضورؐ نے چار ازواج سے تعلقات استوار رکھے تھے اور پانچ سے نہیں رکھے تھے۔ حالانکہ اس تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں، جن میں ابو رزین سے پہلے قتادہ کا قول موجود ہے اور وہ یہ ہے: عن قتادة .... فجعله الله فی حل من ذالك ان یدع من یشاء منهن و یاتی من یشاء منهن بغیر قسم وکان النبی الله یقسم

(قتادہ کہتے ہیں کہ آیت ترجی من تشاء ..... کی رو سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے حلال فرما دیا تھا کہ ازواج میں جنھیں چاہیں چھوڑ دیں اور جنھیں چاہیں باری مقرر کیے بغیر حبالۂ عقد میں رکھیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم باری کی پابندی فرماتے تھے)۔

قتادہ کا یہی قول معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ فتح الباری میں بھی موجود ہے

جیسے اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ فی الحقیقت قول راجح یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سے اللہ تعالیٰ نے اگرچہ باریوں اور تقسیم کی پابندی اُٹھا لی تھی، لیکن آپؐ نے اس دارِ فانی میں قیام کے آخری وقت تک تقسیم کو ترک نہیں فرمایا۔ بخاری شریف، کتاب النکاح میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے: رسول اللّٰہ علیہ وسلم کان یسئل فی مرضہ الذی مات فیہ، این انا غدًا، این انا غدًا — فاذن لہ ازواجہ ان یکون حیث شاء فکان فی بیت عائشۃ حتیٰ مات عندھا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامِ مرض میں پوچھتے تھے، کل مجھے کس گھر میں ہونا ہے، کل مجھے کہاں ہونا ہے تو ازواجِ مطہرات نے آپؐ کو اجازت دی کہ آپؐ جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ پس آپؐ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر میں رہے حتیٰ کہ رحلت فرمائی)۔

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے تفسیر طبری کی حوالے سے یہ بھی فرمایا ہے کہ پانچ ازواج کو بغیر طلاق کے ارجاء، اعتزال میں رکھنے اور ازدواجی تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ واقعہ ایلا میں ہوا ہے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ تک بالاخانے میں معتکف رہے اور تمام ازواج کی تادیب کے لیے ان سے روابط ترک کر دیے تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ ازواجِ مطہرات کی یہ چار اور پانچ کی تفریق ایلا کے وقت ہوئی ہے تو پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اس تفریق و تقسیم کا تعلق مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کی آیت سے ہے اور چار ازواج کی تحدید نازل ہونے کے معاً بعد واقعۂ ایلا رُونما ہوا ہے۔ سورۂ تحریم جس میں ایلا کا ذکر ہے، سورۂ نساء کے بہت بعد ۹ھ میں نازل ہوئی ہے۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب صحاح میں حضرت عمرؓ کی زبانی پورا واقعہ بیان ہے کہ حضرت عمر رضؓ کے ایک انصاری پڑوسی نے آدھی رات کو آ کر حضرت عمر رضؓ کو اُٹھایا اور بتایا کہ ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے تو حضرت عمر رضؓ نے پوچھا کہ کیا والیٔ غسان نے حملہ کر دیا ہے؟ تو انصاری صحابی رضؓ

نے جواب میں کہا: نہیں اس سے بھی بڑا واقعہ رونما ہو گیا ہے، آنحضورؐ نے ازواج مطہرات کو غالباً طلاق دے دی ہے اور ان سے الگ عزلت نشین ہو گئے ہیں۔ حافظ ابن حجر اور دوسرے محدثین نے ثابت کیا ہے کہ غسانیوں کے حملہ کا خدشہ ۹ھ کے اوائل میں تھا۔ فتح الباری، باب فَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ---- میں شرح کرتے ہوئے ابن حجر فرماتے ہیں: فان التخییر کان فی سنة تسع (تخییر کا واقعہ ۹ھ میں پیش آیا تھا) ۱۰ھ میں آنحضورؐ نے حج کا اعلان فرمایا اور حجۃ الوداع کے فریضہ سے فارغ ہوئے۔ ربیع الاول ۱۱ھ میں آپؐ نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ دوسرے الفاظ میں ایلا و تخییر کے جس واقعہ کا ذکر حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ آنحضورؐ کے وصال سے فقط دو سال قبل کا ہے۔ کیا یہ بات قابلِ فہم اور قرینِ قیاس ہو سکتی ہے کہ آپؐ نے حیاتِ طیبہ کے آخری دو سالوں میں ازواج مطہرات میں سے چار کو تو ہر طرح کے ازدواجی تعلقات کے لیے مختص فرمایا ہوا اور بقیہ ازواج کو برائے نام حلقۂ زوجیت میں رکھا ہو۔

مزید برآں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام سورہ نساء کی آیت تحدید کا نتیجہ ولازمہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ سورۃ النساء اور سورہ تحریم کے نزول میں پانچ سال کا زمانی تفاوت ہے؟ مگر ڈاکٹر صاحب کا اصرار ہے کہ چار ازواج کا حکم آنحضورؐ پر بھی لاگو تھا، لیکن اس کی تعمیل و تطبیق آپؐ نے پانچ سال کے بعد کی اور اس شکل میں کی کہ چار کو تو پورے حقوق زوجیت عطا کیے۔ اور پانچ کو "اعزازی" ازواج (علی شرف) کے زمرے میں رکھا۔ پھر اُلٹی زقند لگاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ارجاء وایواء کا واقعہ آیت مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ سے قبل رونما ہوا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لیے پیش فرمایا ہو کہ عامۃ المسلمین سے چار ازواج کی پابندی پر عمل کرنے سے پہلے آنحضورؐ نے خود بھی چار پر اکتفا فرمایا ہو! لیکن ڈاکٹر صاحب نے اکتفا کی جو عجیب و غریب اور غیر معقول صورت ایجاد فرمائی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ع دلم بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

آخر میں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اختصاص و امتیاز "واجبات" میں تو تھا مگر "حقوقِ مادیہ" میں نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ فاضل مؤلف کے ہاں "واجبات" سے کیا مراد ہے اور "حقوقِ مادیہ" میں حقوقِ ازدواجی اور تعلقات زناشوئی کیوں شامل نہیں ہو سکتے؟ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ "حقوقِ مادیہ" میں آنحضورؐ کو اختصاص کیونکر نہ تھا؟ آپ نے بنو ہاشم کے لیے صدقاتِ واجبہ کو ناجائز فرما دیا تھا۔ اپنے ترکے میں وراثت جاری نہیں فرمائی۔ کیا یہ "حقوقِ مادیہ" میں داخل نہ تھے؟

اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" بھی چھپ چکی ہے، اُسے بھی ایک نظر دیکھا جائے، چنانچہ معلوم ہوا کہ اس میں ایک باب کا عنوان "امہات المومنینؓ" ہے۔ یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں سپردِ قلم ہوا اور اب کتاب مذکور میں شامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس مضمون میں بھی فاضل مصنف نے بعینہٖ وہی موقف اختیار کیا ہے جو انہوں نے حالیہ عربی مقالے میں کیا ہے۔ اگر طوالتِ بحث کا خدشہ نہ ہوتا تو اس کے بیشتر اجزا یہاں نقل کر دیئے جاتے۔ تاہم چند اقتباسات دینا ضروری ہے۔ اس باب کا ایک ذیلی عنوان ہے: رسول اللہؐ کو چار سے زائد بیویاں کیوں؟ اس کے تحت فرماتے ہیں:

"یہ سب جانتے ہیں کہ قرآن نے بعض شرائط کے تحت مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت ہے۔ خود رسولؐ اکرم کے حرمِ محترم میں ایک زمانے میں نو بیویاں تھیں۔ ایسا کیوں؟ کیا یہ خصوصیاتِ نبوی میں سے ہے یا کوئی اور معقول وجہ۔ بہر حال یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ تعلیم تو ایک حکم کی دی جائے اور تعمیل میں اُس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ جب کوئی امر خصوصیاتِ نبوی کا ہوتا ہے تو قرآن و حدیث میں صراحت آ جاتی ہے تاکہ کسی بدگمانی یا غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے...... لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں رسول اکرمؐ کے متعلق چار سے زیادہ بیویوں کی خصوصی اجازت کا کوئی اشارہ ہے۔ ان

حالات میں کوئی اور وجہ ہونی چاہیے۔ غور و بحث پر ہماری ناچیز سمجھ میں جو بات آئی ہے وہ حسب ذیل ہے:

مفسروں اور مؤرخوں نے متفقہ طور پر ذکر کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کا آخری نکاح اس آیت کے نزول سے قبل کا واقعہ ہے، جس میں منکوحہ بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کیا گیا.....

مؤرخ اور مفسر بیان کرتے ہیں کہ جب تحدید زوجات کی آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اپنی ازواج کو اختیار دیا کہ جو چاہے تفریق منظور کرے اور آپؐ اُسے گزارہ مہیا فرمائیں گے۔ اور جو چاہے مسکن نبوی کی زاہدانہ اور شدت کی زندگی پر باقی رہے۔ (قرآن $\frac{۲۳}{۲۹،۲۸}$)۔ کون سی عورت ہوگی جو اُمّ المومنین کے قابلِ فخر رُتبے سے دست بردار ہونا پسند کرے۔ غرض جدائی کسی نے بھی منظور نہ کی اور کسی کا کردار بھی قابلِ اعتراض نہ تھا کہ رسول اکرمؐ خود اُسے طلاق دیں۔

اب حسب احکامِ وحی رسول اکرمؐ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ "میں تم کو اس شرط پر اپنی بیویوں کی حیثیت سے باقی رکھ سکتا ہوں کہ زناشوئی کے تعلقات صرف چار سے باقی رکھوں گا، باقی سے نہیں"۔ سبھوں نے اسے منظور کیا۔ اِس وحی میں آپؐ نے (لیظاہر اپنے اجتہاد سے) یہ گنجائش پائی کہ ایسی چار بیویوں کو ادل بدل کرتے رہیں۔ مثلاً ایک مہینہ پہلی چار کو، دوسرے مہینے دوسری چار کو وغیرہ تاکہ چھوڑی ہوئی بیویوں کو دل میں رنج نہ ہو (قرآن $\frac{۳۳}{۵۱}$)۔

کچھ عرصہ بعد تازہ وحی آئی ($\frac{۳۳}{۵۲}$) کہ اب آئندہ اس کی بھی اجازت نہیں رہے گی۔ اور ایک مرتبہ جن چار کا انتخاب کر لیا جائے گا، وہ اٹل ہوگا۔ حضور اکرمؐ نے جن چار کا انتخاب فرمایا وہ نہ کم سنی پر مبنی تھا اور نہ خوب صورتی پر، بلکہ علم و ذہانت اس کا معیار نظر آتا ہے تاکہ عورتوں میں اور خاص کر عورتوں کے خصوص احکام میں اسلامی شریعت کی وہ حامل

اور ترجمان نہیں۔ ان حالات میں رسول اکرمؐ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں رہتا، بلکہ قول کی ممکنہ تعمیل کی پوری کوشش نظر آتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کا عربی مقالہ اور ام ردو کا مضمون ایک دوسرے کا چربہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس تحقیق انیق پر

ع ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیے

(ملک غلام علی)

(بقیہ دینی جدوجہد کا اصل محور)

دعو اللہ کے پیغامات پہنچاتے اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ یُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ - مائدہ) ___ (جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے) بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ - انبیاء) ___ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں، جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے) وغیرہ جیسے کلمات و احکامات کیا معنی رکھتے ہیں اور کس وقت عمل کے لیے ہیں ___ حکمت تو یہ ہے کہ دعوتِ اسلام ٹھنڈے طریقے سے ہو اور مناظرانہ رویہ کے بجائے موعظہ حسنہ کو اختیار کیا جائے۔ اور جس طرح نسخہ کا استعمال کراتے ہوئے مریض کے مزاج اور اس کی کیفیت کو بھی دیکھا جاتا ہے، اسی طرح اس قوم کی مصلحت بھی پیشِ نظر رہے، لیکن اس علاج کو کون سمجھدار حکمت سے تعبیر کرے گا کہ مریض کے تو پھیپھڑے اور دل گردے گل سڑ رہے ہوں، لیکن دوا دی جائے صرف کھانسی اور بخار کی۔ (باقی)

مطبوعات

کتاب العلم | از جناب عبدالعزیز خالد۔ ناشر: خالد اکیڈیمی، ۱۰۳ نوازش علی روڈ، لاہور۔ کاغذ طباعت بہت خوب، جلد مضبوط اور زینت افزا۔ صفحات: ۸۰۰۔ قیمت: ۵۰۰/۔ روپے۔

ایک کتاب العلم کیا، عبدالعزیز صاحب کے یہاں تو علم و ہنر کا چڑھا ؤ میں آیا ہوا دریائے سندھ ہے۔ کچھ دیر ہم اس کے کنارے کنارے دوڑے مگر نہ اور چھور معلوم ہوسکا، نہ منبع تک رسائی، نہ دہانہ تک پہنچ، نہ محشر آرا حرکت و روانی میں اتنی مہلتِ سکوں میسر کہ ایک ساغر ہی بھرا جاسکے۔ اپنی اپنی قسمت! یہاں بہت سے دریا ہیں اور دریاؤں کے کنارے بے شمار تہی ساغر اور تشنہ لب بسمل۔ بات ایک فرات کے ماتم پر ہم ختم نہیں ہوجاتی۔

خیر بہت سی کتابیں لکھنے کے بعد جن کی گنتی یاد رکھنا بڑی قابلیت کی بات ہے، اب انہوں نے "کتاب العلم" لکھی ہے۔ ہم جیسے اَن پڑھ تو چونک اٹھے۔

علم کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے اور جو کچھ پہلے کے صُحُف میں ہے۔ پھر علم کے متعلق احادیث اور علماء اور شعراء کے اقوال کا ایک وسیع دائرہ ہے، اِن تمام اطراف سے روشنی لے کر جناب خالد نے علم کے بارے میں بہت سے نکاتِ حکمت جمع کر دیے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ یہ چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا ہے علم کے بارے میں۔

اب مسئلہ آتا ہے عربی آیات و احادیث کا، سو یوں تو کمال ہے کہ ہر جملے اور فقرے کا ترجمہ مصرعِ موزوں میں ہو، یا پورے شعر یا نہ اکہ اشعار میں۔ لیکن اصل مشکل

یہ ہے کہ قرآن میں خصوصاً اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات میں عموماً بیان کا ایک ایسا دل گداز انداز پایا جاتا ہے، ان میں ایک خاص بہاؤ ہوتا ہے جو یوں بھی ترجموں میں منتقل ہونا مشکل ہے، کجا کہ آپ مصرعوں اور شعروں میں ترجمہ لکھیں۔ وہ کلام تو فنونِ شعر کی معنویت سے آزاد ہے، اُسے آپ اپنے کسی موضوع کی رُوح بنا سکتے ہیں۔ اس کی طرف کنایہ یا تلمیح سے قاری کا ذہنی ربط قائم کر کے شعر کے فنی لطائف کو پُرزور بنا سکتے ہیں۔ مگر ترجمہ میں جب ایک مفہوم ہی کی نہیں، الفاظ کی بھی پابندی ہوتی ہے، آپ صرف کلام کو موزوں بنا سکتے ہیں۔ مگر صرف وزن و بحر کے زور سے شعری جمال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن و حدیث (اور شاید دوسری زبانوں) کے کسی علمی بیان کا اوّل تو لفظوں کی پابندی کے ساتھ شعری پیرائے میں لانا اور پھر اس میں تشبیہات، نزاکتِ تخیل اور جذباتی زور کو پیدا نہ کر سکنا ہم کو اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ ایسی عبارت کے ترجمے نثر میں کیے جائیں تو وہ ترجمہ کے...... الفاظ کی حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب کی وجہ سے زیادہ پُرزور بن جاتی ہے۔

کتاب العلم میں نہ تو قرآن و حدیث، قدیم نوشتوں اور شعراء کے کلام کے مفہوم کو بطرزِ احسن سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ ان کے متن کے سے حُسن سے بہرہ ملتا ہے، اور نہ ترجمہ کی نثر موزوں کے مصرعوں کی شکل میں الگ الگ ٹکڑے لطف دیتے ہیں۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ——— متبادل ترجمے ملاحظہ ہوں:

——— نادانوں میں سے کہیں نہ پَس ہو جانا ——— (یہ پَس ہو جانا بھی خوب ہے کوئی ہسپتالوں والی پَس نہ سمجھ لے)۔

——— پس ہونا نادانوں میں بہت ——— (وزن کی خاطر کیسی بھدی ترتیب ہے کلام کی)۔

——— ہو نہ گہ شریکِ نادانان ——— (بہتر ہے)

——— ہو نہ زنہار جاہلوں میں سے ——— (بہتر ہے)

آیت ۱۳: اَمۡ اَنَا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُ مِنۡ اَطۡرَافِهَا

—— انہوں نے یہ دیکھا نہیں ہے برابر گھٹاتے چلے آ رہے ہیں

زمیں کو ہم اس کے کناروں سے (چاروں طرف سے)

اسی ضمن میں ایک قول بیان ہوا۔ قِیۡلَ ھُوَ مَوۡتُ الۡعُلَمَاءِ

—— کہا بعض اصحابِ تفسیر نے: موت ہے عالموں کی زمیں کے گھٹاؤ کا مطلب۔

دوسری فصل (صحائفِ پیشیں) کے تحت ص ۴۴

—— ہونٹ سیانوں کے علم بولتے ہیں (کیا لطف اس کلام میں!)

ص ۴۷:-

—— احمقوں کا دل ہے ان کے مُنہ میں (بے کیف عبارت)

داناؤں کے دل میں ہے ان کا مُنہ (بے کیف عبارت)

ص ۴۹:-

—— جو احمق کو تعلیم دیتا ہے مٹی کے وہ ٹوٹے برتن جوڑے

ص ۵۰ - نمبر ۱۲۵:-

—— دے نہ جاہل کو جواب اُس کی حماقت کے مطابق

کہ نہ ہو جائے کہیں تو بھی اُس کی مانند

ص ۵۰ - نمبر ۱۲۶:-

—— دے تو جاہل کو جواب اس کی حماقت کے مطابق

کہ سمجھ بیٹھے نہ اپنے کو کہیں دانش ور

ص ۲۸۷ - نمبر ۶۷۰:-

مَنۡ اَشَرُّ النَّاسِ ؟ عَالِمٌ لَا یَنۡفَعُ بِهٖ

—— ہے کون بد ترینِ مردماں ؟

وہ عالم اپنے علم سے جو ہو نہ منتفع

اِن مثالوں کا مطلب یہ نہیں کہ کام میں قدر و قیمت نہیں - بلکہ بعض اچھی اچھی

ادبی عبارات کے مؤثر ترجمے بھی ہیں۔

مگر قرآن و حدیث کے ترجمے کے سلسلے میں مجھے خاص توجہ اس لیے کرنی پڑی کہ میں خالد صاحب کے نظریے کو جانتا ہوں کہ وہ ترجمہ میں عبارت کے اصل تاثر کو منتقل کرنے کے قائل نہیں ہیں، وہ عربی کی عبارت کے ان خلاؤں کو بھرنے کا اذن بھی کسی کو نہیں دیتے، جنہیں عربی بولنے والوں کے ذہن از خود بھر لینے کے عادی ہوتے ہیں، وہ جلالت، غصے، تنقید، عتاب، ملامت، منظرکشی وغیرہ کے خاص تقاضوں کا لحاظ کرنے کو گمراہی سمجھتے ہیں اور بس لفظ کی جگہ لفظ لٹکانے پر بضد رہے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے منظوم ترجمے کا کام قرآن و حدیث کے دائروں میں شروع کر دیا تو پھر الفاظ کے انتخاب میں وزن کا لحاظ کرنا پڑا، جیسے تفسیر بے نقط میں متبادل الفاظ ایسے ڈھونڈنے پڑے جو بلا نقطہ ہوں۔ گویا ایسی ہر پابندی قرآن کے لفظی متن کے ترجمے میں تو خلل انداز ہوگی۔ مثلاً فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کی ترجمہ کاری میں ہم نے نمونہ پیش کر دیا ہے۔

اصل میں بے جا مبالغہ آرائیوں یا ردِ عمل کے اثر میں جو کلیے آدمی خود بنا کر دوسروں پر حکم لگانے لگتا ہے، وہ علم و فن کی راہ میں بڑھتے ہوئے ٹوٹ جاتے ہیں۔

یہ گفتگو تو بے تکلفی کی وجہ سے ہے، ورنہ ہم کیسے نہ تسلیم کریں کہ آٹھ سو صفحات کی کتاب انہوں نے بڑی محنت و کاوش سے تیار کی ہے، اور اس کا مطالعہ دینی، ادبی اور شعری مطالعہ رکھنے والوں کے لیے مفید اور باعثِ دلچسپی ہوگا۔

SOCIO-ECONOMIC SYSTEM OF ISLAM	از جناب ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب۔ ناشر: ملک سنز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز،

۱۷- ڈی مکہ کالونی، گلبرگ ۳، لاہور۔ صفحات: ۴۴۳۔ قیمت: ۱۵۰/ روپے

یہ کتاب ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ صاحب کے اُن اُنیس انگریزی تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے، جو وقتاً فوقتاً ملکی اور غیر ملکی کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ یہ مقالات

انسانی زندگی کے اہم مسائل اور عصری موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً اسلام اور فلاحی ریاست، اسلام کا معاشی معجزہ، معجزۂ قرآن، صبغۃ اللہ، توبہ کی حقیقت، نفسیات، شاہ ولی اللہ کی مابعد الطبیعیات، عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث، غلامی کا مسئلہ وغیرہ۔

اِن مقالات میں اعلیٰ محققانہ اور عالمانہ اندازِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔ اسلوبِ بیان میں قدیم و جدید رنگ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسلام کے خلاف مستشرقین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جدید ذہن کو اپیل کرنے والا دعوتی اور متکلمانہ انداز اپنایا گیا ہے اور یہ ایک مفید اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ (رفیق چوہدری)

A BRIEF POLITICAL HISTORY OF AFGHANISTAN.

از جناب عبدالغنی (مرحوم)
مرتبہ: عبدالجلیل نجفی۔

ناشر: نجف پبلشرز، فضلِ ربی منزل۔ سوڈی وال سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور۔
صفحات: ۹۵۶۔ مجلد قیمت: ۴۴۰/- روپے

جناب عبدالغنی صاحب (مرحوم) کی یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی لیکن مرحوم کی زندگی میں بعض وجوہ کی بنا پر شائع نہ ہوسکی۔ اب پہلی مرتبہ ۱۹۸۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

عبدالغنی (مرحوم) گوجرہ گجرات میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ امیر عبدالرحمٰن والیٔ افغانستان کی دعوت پر ۱۸۹۱ء میں افغانستان بلا لیا گیا تھا۔ جہاں حکومت ہی کی خواہش پر انہوں نے تعلیمی اصلاحات کیں۔ جدید تعلیمی ادارے اور اسکول کھولے۔ مگر بعض میں کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ پھر امان اللہ خان کے دورِ حکومت میں انہیں ۱۹۱۶ء کو رہا کیا گیا۔ اور پھر ۱۹۲۱ء میں افغانستان کی قانون ساز اسمبلی کا ممبر بنا دیا گیا۔

زیرِ نظر کتاب افغانستان کے قدیم وجدید حالات و اقعات اور اس کی سیاسی تاریخ کے موضوع پر ہے۔ اور افغانستان کے قدیم زمانے سے لے کر محمد ظاہر شاہ کے ابتدائی دور کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ٹھوس تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مصنّف نے خود افغانستان میں رہ کر اس کتاب کو فارسی اور انگریزی کے مستند اور معتبر حوالوں اور اصل ماخذ کی مدد سے تالیف کیا ہے۔ بعض حالات و واقعات کی تفصیلات کے لیے تاریخی دستاویزات کی عبارات بھی درج کی گئی ہیں۔

ہماری رائے میں قدیم وجدید افغانستان کی سیاسی تاریخ پر یہ ایک اہم اور مستند تاریخی کتاب ہے اور تاریخ و سیاست سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے ایک نہایت مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔

خوب صورت جلد، بہت اچھی گٹ اپ البتہ قیمت خاصی زیادہ ہے۔

(رفیق چوہاری)

تصحیح (شمارہ اکتوبر ۹۰ء)

ص ۳ (اشارات) "خان لیاقت علی خان" کے بجائے "محمد علی بوگرا"

ص ۱۰	سطر ۱۷	"کو" کے بجائے "کی"
" ۱۲	سطر آخری	"ڈنگ" کے بجائے "ڈنک"
" ۲۳	سطر ۸	"اِنَّمَا" کے بجائے "انما"
" ۲۴	سطر ۱۴	"السلام" کے بجائے "الاسلام"
" ۳۱	سطر ۷	"لیسھوا" کے بجائے "لا یسھو"
" ۴۶	سطر ۱۸	"یاذوالجلال" کے بجائے "یا ذا الجلال"
" ۵۴	سطر آخری	صحیح "نئے امیر جناب سراج الحسن ہیں"

وفیات

سراج منیر مرحوم

آہستہ برگِ گُل بہ فشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

ماہ ستمبر کی ستم گاریاں غیر معمولی طور پر ہمارے صبر کی حدود کو بار بار توڑتی ہیں، ہمارے بہت سے بزرگ اور بہت سے عزیز، بہت سے چاہنے والے اور بہت سے چہیتے، بہت سے اہل دل اور اربابِ قلم اسی ماہ میں ہم سے جدا ہوتے رہے۔ یعنی دوسرے مہینوں سے تناسب زیادہ رہا۔

۱۹۹۰ء نے ماہ ستمبر کی ۲۵ کی صبح کو جادۂ حیات کا وہ نامور مسافر ہم سے جدا ہو گیا، اور ایک خاموش پیغام دے گیا کہ "قیامت کو ملیں گے"۔ اور یہاں بے شمار دلوں میں قیامت بپا ہو گئی۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ!

سراج منیر مولانا عبدالمتین ہاشمی کے شجرِ علم و تربیت کا بے مثال ثمر تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے شہر سید پور سے لاہور آئے اور پھر سارے خاندان کے لیے لاہور ہی گھر بن گیا۔ یہاں تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کیے، معلم بھی بنے، متکلم بھی زور کے تھے، یہاں تک کہ جب اس دریا کو کنارے روکنے میں ناکام ہو گئے تو اس کا پانی علم، ادب، تہذیب اور تنقید کی سوکھی کھیتیوں میں پھیل گیا۔

سراج منیر کو علمِ دین اس سے نہ روک سکا کہ وہ جدید علوم حاصل کرے، مگر دورِ جدید کی فلسفہ طرازیاں اُسے اس سے باز نہ رکھ سکیں کہ وہ ادب و تنقید کے اس معرکہ زار میں کام کرے جہاں ترقی اور جدیدیت کے نام سے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

فروری ۱۹۹۰ء

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

رُوداد اجتماعِ عام

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسہ عام
- اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد
امیر جماعت اسلامی

اعلامیہ

رپورٹ جماعت اسلامی پاکستان
۸۳ء ــــ ۸۹ء

اجتماعِ عام نمبر ۸۹ء

اشاعت فروری ۹۰ء

دیگر تقاریر:

- دروس قرآن وحدیث
- ایمان اور دعوت وجہاد
- رُحماء بینھم
- پاکستان میں جماعت کا کردار
- خواتین کا کردار
- نوجوانوں کا کردار
- ہم کیا معاشی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں؟
- بین الاقوامی مندوبین

ٹائیٹل دیدہ زیب

کتابت کمپیوٹرائزڈ

ضخامت غیر معمولی

قیمت:

مقررین

- مولانا جان محمد عباسی
- پروفیسر غفور احمد
- چودھری رحمت الٰہی
- پروفیسر خورشید احمد
- خرم مراد
- مولانا گوہر رحمن
- مولانا فتح محمد
- مولانا عبدالحق
- حافظ محمد ادریس
- لیاقت بلوچ
- سید منور حسن

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیوٹ) لمیٹڈ - اردو بازار لاہور

فون: ۳۲۴۴۶۸ ــ ۶۸۶۳۶ ○ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۳